اسلامی شریعت انتہائی معقول اور سادہ ہے مگر ہم نے اپنی جہالت کی بناپر شادی بیاہ کو ایک انتہائی مہنگی اور مشکل ترین چیز بنا کر رکھ دیا ہے

نکاح اور مذاہب عالم

ڈاکٹر حشمت جاہ

نام کتاب
نکاح اور مذاہب عالم

مؤلف
ڈاکٹر حشمت جاہ

ناشر
شمع بک ایجنسی کراچی

سن اشاعت
فروری 2008ء

زیر اہتمام
خالد علی

قیمت
-/60 روپے

اسٹاکسٹ
ویلکم بک پورٹ اردو بازار کراچی
صابری دارالکتب اردو بازار لاہور
رشید نیوز ایجنسی فریئر مارکیٹ کراچی
اشرف بک ایجنسی کمیٹی چوک راولپنڈی

فہرست

شریعت میں نکاح کی آسانی

قصور کس کا ہے؟

اسلامی قانون کی رو سے نکاح ایک آسان اور سادہ ترین ضابطہ ہے مگر وہ مختلف قوموں اور ان کے رسم و رواج کے باعث آج کل ایک مشکل اور پیچیدہ سماجی مسئلہ بن گیا ہے۔ مگر اس سلسلے میں سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ امت جو اصلاح عالم کے لئے مبعوث کی گئی تھی وہ خود آج دیگر قوموں کے رسم و رواج سے متاثر ہو کر اسلامی قانون اور اسلامی سرچشمہ حیات سے دور ہو چکی ہے۔

اس اعتبار سے شادی بیاہ کا معاملہ آج ایک پیچیدہ اور لاینحل سماجی مسئلہ بن گیا ہے اور خاص کر لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ کیونکہ اول تو غیر قوموں کے میل جول کے باعث اس سلسلے میں ایسے بے شمار رسوم و خرافات نے جنم لے لیا ہے جو خرچیلے تو ہیں ہی مگر مقصد نکاح سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے اور پھر جہیز اور جوڑے گھوڑے کے بھیانک رواج نے ایک تو کریلا اور پھر نیم چڑھا کے مطابق رہی سہی کسر بھی پوری کرتے ہوئے اچھے اچھوں تک کو دن ہی میں تارے بھی دکھانے شروع کر دیئے ہیں۔ چنانچہ جب شادی بیاہ کا نام آتا ہے تو متوسط ہی نہیں بلکہ بعض خوشحال لوگوں تک پر بھی اداسی اور مردنی سی چھا جاتی ہے، ہمارا اور آپ کا کیا شمار!

تو اس سلسلے میں سارا قصور خود ہمارا ہے اور ہم پر جو بھی مصیبت نازل ہو رہی ہے اس کے [illegible] ہیں کیونکہ یہ سارے غیر ضروری رسوم و رواجات خود ہمارے ہی ایجاد کردہ ہیں، [illegible] میں پڑ کر روپیہ پانی کی طرح بہانا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلامی قانون و شریعت سے ان کا دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اسلامی قانون تو دنیا بھر کے خرافات کو مٹانے اور نوع انسانی کو بوجھل زنجیروں سے آزاد کرانے کے لئے رحمت بن کر آیا تھا۔ مگر ہم نے

اپنی نادانی یا دکھاوے کی خاطر اسلامی قانون سے ناطہ توڑ کر اپنے آپ کو پھر ہزاروں سال پرانے دور میں پہنچادیا ہے اور وہی بوجھل زنجیریں پھر سے پہن لی ہیں جنہیں کاٹ کر اسلام نے ہم کو آزاد کرایا تھا اور چین وسکون اور سلامتی کا راستہ دکھایا تھا۔ اگر آج ہم اس ناقابل برداشت بوجھ کی شدت سے کراہ اور بلبلا رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس میں قصور صرف ہمارا ہی ہے کیونکہ آج ہماری زندگی انتہائی مسرفانہ اور ریاکارانہ بن گئی ہے اور ہم جادۂ حق سے نہ صرف ہٹ گئے ہیں بلکہ اپنے نمائشی طرز عمل کے ذریعے غریبوں کی زندگی بھی دوبھر کئے ہوئے ہیں۔

لہٰذا آیئے دیکھیں کہ اس سلسلے میں اسلام ہمارے لئے کیا رہنمائی پیش کرتا ہے اور ہم اپنی ناواقفیت کے باعث اپنی زندگی کو کس طرح ایک جہنم بنائے ہیں۔

خلاق عالم کا حسین تحفہ

عورت انسان ہونے کی حیثیت سے نہ صرف مرد کے برابر ہے بلکہ وہ انسان کے لئے خلاق عالم کا سب سے زیادہ قیمتی اور حسین تحفہ ہے جسے اس نے مرد کی تنہائی اور اس کی وحشت دور کرنے کی غرض سے پیدا کیا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کی تصریح کے مطابق عورت مرد کے لئے باعث تسکین ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْکُنَ اِلَیْهَا : وہی ہے جس نے تم کو ایک ہستی سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا ساتھی بنایا تا کہ وہ اس سے سکون حاصل کرے۔ (سورۃ اعراف: 7 آیت 189)

ظاہر ہے کہ جو لوگ خداوند کریم کے اس انمول تحفہ کی قدر کرتے ہیں وہ خوش و خرم زندگی گزارتے ہیں اور جو اس کی ناقدری کرتے ہیں وہ بہت جلد اس کی سزا بھی پالیتے ہیں اسی وجہ سے نکاح کے ازدواجی زندگی گزارنا انبیائے کرام کی سنت قرار دیا گیا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِکَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّیَّةً

(اے محمدؐ) ہم نے آپ سے پہلے یقیناً (بہت سے) رسول بھیجے اور انہیں بیویوں اور اولاد سے بھی نوازا۔ (سورۃ رعد 13 آیت 38)

نکاح کرنا بھی عبادت ہے

نکاح اگرچہ بظاہر ایک دنیوی فعل معلوم ہوتا ہے مگر درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ اسلام کی نظر میں وہ ایک عبادت بھی ہے کیونکہ اس کے ذریعے بے شمار دینی و دنیوی فوائد وابستہ ہیں۔ اسی وجہ سے اسے آدھا دین قرار دیا گیا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں مذکورہ ہے۔

اِذَا تَزَوَّجَ الْعَبْدُ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ نِصْفَ الدِّیْنِ فَلْیَتَّقِ اللّٰہَ فِی النِّصْفِ الْبَاقِی: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی شخص نکاح کرتا ہے تو وہ آدھے دین میں کمال حاصل کر لیتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ بقیہ آدھے میں بھی اللہ سے ڈرے۔ (ترغیب وترہیب جلد سوم صفحہ 42)

نیز ایک اور حدیث کے مطابق جن لوگوں کا رزق اللہ نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے ان میں سے ایک وہ شخص بھی ہے جو نکاح کر کے گناہوں سے بچا رہنا چاہتا ہو۔

وَالنَّاکِحُ یُرِیْدُ اَنْ یَّسْتَعِفَّ: اور نکاح کرنے والا جو پاک دامن رہنے کا خواستگار ہو (جامع ترمذی، جلد چہارم صفحہ 184)

صحیح عورت کا انتخاب

اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ نکاح کا مقصد موج و مستی کرنا اور گلچھرے اڑانا نہیں ہے بلکہ اس کا صحیح مقصد جنسی بے راہ روی سے بچنے کی غرض سے ایک پاکیزہ زندگی گزارنا یعنی ایک صالح تمدن کی تعمیر کے لئے دل و دماغ کی یکسوئی اپنی جانشینی کے لئے اولاد حاصل کرنا اور دیگر دینی اور دنیوی فوائد ہیں۔ اسی بناء پر اسلام کی نظر میں نکاح کرنا بھی ایک عبادت ہے کیونکہ اس سے نسل انسانی کے تسلسل کے ساتھ ساتھ ایک صالح تمدن کا ارتقا بھی مطلوب ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں ایسی عورت کا انتخاب کرنا چاہئے جو ان مقاصد کے حصول کی راہ میں مرد کی جیون ساتھی بن کر اس کی معاونت کر سکے۔ مگر اس کے برعکس آج عام طور پر معیار پیسے اور حسن کا ہو گیا ہے۔ یعنی بجائے مذکورہ بالا فوائد کے سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ لڑکی جہیز میں اپنے ساتھ کتنا مال اور کتنا پیسہ لائے گی؟ تو ظاہر ہے کہ یہ ایک غلط

معیار ہے کیونکہ مال و دولت تو ایک ڈھلتی چھاؤں ہے جو زیادہ دن ساتھ نہیں دے سکتی۔ لہٰذا ایک فانی چیز کی خاطر ہمیشہ کے سکون و راحت کو قربان کر دینا دانشمندی سے بعید ہوگا۔ اس لئے عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ نکاح کے لئے دیندار اور اچھے اخلاق والی لڑکی کو ترجیح دی جائے جیسا کہ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

"کسی عورت سے چار باتوں کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے۔ (1) اس کے مال کی وجہ سے، (2) اس کے خاندان کی وجہ سے، (3) اس کی خوب صورتی کی وجہ سے، (4) اور اس کی دینداری کی وجہ سے۔ پھر فرمایا کہ تم دیندار عورت کو منتخب کرلو۔" (صحیح بخاری کتاب النکاح جلد سوم صفحہ 123)

ایک دوسری حدیث کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "یہ پوری دنیا ایک پونجی ہے اور دنیا کی بہترین پونجی ایک نیک سیرت بیوی ہے۔" (صحیح مسلم کتاب الرضاع جلد دوم صفحہ 109)

خیر و برکت والی عورت

عورت کی سعادت و خوش بختی یہ ہے کہ وہ دیندار ہونے کے ساتھ ساتھ کم بوجھ والی بھی ہو، یعنی ایسی شاہ خرچ نہ ہو کہ شوہر کو کنگال اور دیوالیہ بنا کر چھوڑ دے اور کسی کا دیوالیہ ہونا زیادہ تر فضول خرچی کی بنا پر ہوتا ہے اور فضول خرچیاں زیادہ تر شادی بیاہ کے موقعوں پر کی جاتی ہیں۔ لہٰذا اس معاملے میں میانہ روی اور کفایت شعاری کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی عورتوں کی بہت تعریف کی ہے اور انہیں بہت بابرکت بتایا ہے جن کا نکاح نہایت درجہ کفایت شعاری کے ساتھ اور آسان طور پر واقع ہوا ہو۔

اعظم النساء برکۃ الیسرھن مونۃ: برکت کے اعتبار سے عظیم تر عورتیں وہ ہیں جو بوجھ اعتبار سے زیادہ آسان ہوں (مسند احمد جلد ششم صفحہ 145)

اس میں شادی بیاہ کا خرچ اور گھر گرہستی کے اخراجات دونوں شامل ہو سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کفایت شعاری کی وجہ سے خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے اور فضول خرچی کی وجہ سے خدا کا غضب نازل ہوتا ہے کیونکہ مال و دولت بھی خدا کی ایک امانت ہے اور فضول

خرچی کا مطلب یہ ہے کہ ہم کو اس امانت کا کوئی پاس و لحاظ یا خدا کی عنایت و مہربانی کی کوئی قدر نہیں ہے نتیجہ یہ کہ فضول خرچ آدمی بہت جلد کنگال بن جاتا ہے۔ لہٰذا انسان کو فضول خرچی سے پرہیز کرنا چاہئے۔

نوجوانوں کے بیاہ میں عجلت

کوئی لڑکا ہو یا لڑکی، جب بالغ ہو جائے تو اس کے نکاح میں جلدی کرنی چاہئے اور یہ بات شرعی و عقلی دونوں اعتبار سے ضروری ہے۔ ورنہ بعض صورتوں میں سنگین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ قرآن اور حدیث میں غیر شادی شدہ مردوں اور عورتوں کا نکاح (بعجلت) کرا دینے کی تاکید اس طرح آئی ہے۔

وَ اَنۡکِحُوا الۡاَیَامٰی مِنۡکُمۡ: اور تم میں جو بے نکاح لوگ (مرد و عورتیں) موجود ہیں، ان کے نکاح کرادو۔ (سورۃ نور 24: آیت 23)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے ایک مرتبہ فرمایا: "اے علی تم تین باتوں میں تاخیر مت کرو۔ (1) جب نماز کا وقت ہو جائے، (2) جب جنازہ حاضر ہو جائے، (3) جب بے نکاحی عورت یا مرد کے لئے موزوں رشتہ مل جائے۔ (جامع ترمذی جلد اول صفحہ 320)

واضح رہے اس موقع پر قرآن اور حدیث میں "ایامی" اور "ایم" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ "ایم" واحد کا لفظ ہے۔ جس کی جمع "ایامی" آتی ہے اور یہ لفظ غیر شادی شدہ مرد اور عورت دونوں کے لئے عام ہے۔ پھر اس میں کنواری، رنڈوا یا بیوہ اور مطلقہ کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ اس اعتبار سے اسلامی شریعت میں جس طرح کنوارے لڑکوں اور لڑکیوں کے بیاہ میں جلدی کرنی چاہئے اسی طرح رنڈووں اور مطلقہ عورتوں کے نکاح میں بھی عجلت کرنی چاہئے۔ بیوہ یا مطلقہ شرعاً کسی بھی طرح منحوس نہیں ہے۔

بہر حال حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جب تمہاری اولاد بالغ ہو جائے تو ان کا نکاح کردو اور ان کے گناہ مت اٹھاؤ۔ (مسند فردوس)

نکاح مشکل کیوں؟

نکاح میں اگر چہ بہت سے معاشرتی وتمدنی اور روحانی فوائد پوشیدہ ہیں مگر بنیادی طور پر وہ انسانی ضرورت کی ایک چیز ہے۔ یعنی خلاق ازل نے انسان کی فطرت میں اپنی جنس مخالف سے ملاپ کرنے کا داعیہ پوری طرح سمو دیا ہے تا کہ انسان کاروبار حیات سے اکتا نہ جائے بلکہ وہ ایک حسین سہارے کے ساتھ انسانی تمدن کے آگے بڑھاتا اور اس میں نئے گل وگلزار پیدا کرتا رہے۔ چنانچہ انسان کو جس طرح بھوک پیاس لگتی ہے اسی طرح اس میں جنسی خواہش بھی پیدا ہوتی ہے اور جس طرح بھوک پیاس مٹانے کا انتظام کیا جاتا ہے اسی طرح انسان کو جنسی خواہش پوری کرنے کی غرض سے بھی جائز اور آسان طریقوں سے اس کا اہتمام ضروری ہے۔ ورنہ اس کے برے نتائج بھی نکل سکتے ہیں اور بے جا قسم کی پابندیوں یا مشکلات سے کئی طرح کی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

اسی وجہ سے اسلام نے تاکید کی ہے کہ نکاح نہایت سادہ طریقے سے ہو اور فضول خرچی سے بچا جائے جو تمام خرابیوں کی جڑ ہے اور جہاں تک ہو سکے نکاح مسجدوں میں کیا جائے۔ ہمارے موجودہ رسم ورواج اور فضول خرچیاں تمام تر غیر قوموں کے میل ملاپ اور اندھی تقلید کا نتیجہ ہیں جن کو ترک کر کے صحیح اسلامی طریقہ اپنانا چاہئے۔ اسلامی قانون ہر امیر وغریب کے لئے خیر وبرکت کا باعث ہے بلکہ وہ پوری دنیائے انسانیت کے لئے روشنی کی ایک کرن ہے۔ مگر ہم محض اپنی جہالت اور جھوٹی شان کی نمائش کی خاطر اس آسان ترین ضابطہ حیات کو ترک کر کے معاشرہ کو انتشار اور تباہی کے دہانے تک پہنچا چکے ہیں۔ لہٰذا اب ہمیں پوری طرح ہوش میں آجانا چاہئے۔

نکاح کتنا آسان ہے؟

چنانچہ مختلف حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی دور میں نکاح بالکل آسان طور پر اور بغیر کسی تیاری کے انتہائی سادگی کے ساتھ ہو جایا کرتا تھا۔ ادھر رشتہ منظور ہوا کہ ادھر فوراً اسی مجلس میں نکاح بھی ہو گیا۔ نہ منگنی کی رسم ہے اور نہ بارات، نہ زرق برق پوشاک ہے اور

نہ دور ونزدیک کے تمام رشتہ داروں کو اکٹھا کر کے میلہ ٹھیلہ کرانا، نہ بریانی کی دیگیں اتر رہی ہیں اور نہ "سلامیاں" وصول کی جا رہی ہیں۔ نہ بنئے کے پاس جائیداد رہن رکھی جا رہی ہے اور نہ برسوں کی گاڑھی کمائی ایک ہی دن میں بے دردی کے ساتھ لٹائی جا رہی ہے، جس کے نتیجے میں ایک دن کا سلطان کہلانے کے بعد دوسرے دن پھر وہی فقیر کے فقیر ہی رہتے ہیں۔

بہر حال اس موقع پر اسلامی دور کے چند نمونے ملاحظہ ہوں جن میں ہمارے لئے بہت سے اسباق موجود ہیں کہ نکاح اسلام میں درحقیقت کیا تھا اور اسے آج ہم نے کیا بنا کر رکھ دیا ہے؟

نکاح دو لفظوں میں

نکاح درحقیقت دو لفظوں کا نام ہے۔ چنانچہ دور رسالت کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک خاتون نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہو کر کہتی ہیں کہ میں نے اپنے آپ کو آپ کے حوالے کر دیا (یعنی میں اپنے آپ کو آپ کی زوجیت میں دیتی ہوں) تو آپ فرماتے ہیں کہ آج کے دن مجھے عورتوں کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ اس پر ایک صحابی عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ میرا اس عورت سے نکاح کرا دیجئے۔ آپ پوچھتے ہیں کہ تیرے پاس مہر میں دینے کے لئے کیا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر آپ پوچھتے ہیں کہ تمہیں قرآن کی کون کون سی سورتیں یاد ہیں؟ وہ کہتے ہیں کہ فلاں اور فلاں سورتیں۔ تب آپ فرماتے ہیں کہ قرآن کی جو سورتیں تمہارے پاس موجود ہیں ان کے عوض میں نے تمہیں اس عورت کا مالک بنا دیا۔ (صحیح بخاری کتاب النکاح، جلد ششم صفحہ 136)

بس اتنا کہنے سے نکاح ہو گیا۔ نیز اس حدیث میں ہمارے لئے ایک دوسرا سبق یہ بھی ہے کہ نکاح سے پہلے مہر کا انتظام کرنا چاہئے۔ یہ نہیں کہ لمبا چوڑا مہر تو باندھ لیا مگر ادا کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا واقعہ

مشہور صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ دربار رسالت میں

اس حال میں حاضر ہوتے ہیں کہ ان کے ہاتھ میں کچھ پیلا نشان (زعفران) کا موجود تھا۔ اس پر آپ نے دریافت فرمایا کہ اے عبدالرحمٰن یہ زردی کیسی ہے؟ انہوں نے بتایا کہ میں نے ایک انصاری عورت سے نکاح کرلیا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ ولیمہ اگر چہ ایک بکری ہی کے ذریعے ہو۔ (صحیح بخاری کتاب النکاح، جلد ششم صفحہ 118)

اس حدیث کے ذریعے جو سب سے بڑا سبق ملتا ہے وہ یہ ہے کہ نکاح کے موقع پر دور اور نزدیک کے تمام رشتہ داروں کو تو درکنار خود اپنے "بزرگوں" تک کو بلانا بھی ضروری نہیں ہے۔ ورنہ صحابی موصوف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شرکت کے بغیر نکاح نہ کرتے۔ جب کہ آپ کو اس کی اطلاع ان کے ہاتھ کی زردی دیکھ کر ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر ان کے لئے بزرگ اور کون ہوسکتا تھا؟ مگر انہوں نے حصول برکت ہی کی نیت سے سہی آپ کی شرکت ضروری نہیں سمجھی۔ اس واقعہ سے اس دور کی معاشرت کی ایک واضح تصویر ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔

اور اس واقعہ میں دوسرا سبق یہ ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ولیمہ کرنے کے لئے کہا۔ چونکہ صحابی مذکور ایک مالدار آدمی تھے اس لئے آپ نے فرمایا کہ کم از کم ایک بکری کے ذریعے ولیمہ ہونا چاہئے۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ولیمہ کرنا دلہا کی ذمہ داری ہے دلہن والوں کی نہیں لہٰذا دلہن والوں سے دعوت کا مطالبہ کرنا اور اس پر اصرار کرنا ایک غیر شرعی حرکت ہے۔

حضرت حفصہؓ کا واقعہ

حضرت عمر بن الخطابؓ کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ بیوہ ہوجاتی ہیں، جن کا نکاح بعد میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتا ہے اور اس کی لمبی کہانی ہے۔ مگر اس عقد سے پہلے حضرت عمرؓ اپنی صاحبزادی کے نکاح ثانی کی بات حضرت عثمان بن عفانؓ ان سے فرماتے ہیں کہ اگر انہیں منظور ہو تو وہ حفصہ سے نکاح کرلیں۔ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ میں اس معاملے میں غور کروں گا۔ چند دنوں کے بعد دوبارہ ان دونوں کی ملاقات ہوتی ہے تو حضرت عثمان تحرماتے ہیں۔

نکاح اور مذاہب عالم

تَـلـبَـدَ الی اَن لا اَتزوّج یومی هذا: مجھ پر ظاہر ہوا ہے کہ میں آج کے دن بیاہ نہ کروں۔ (صحیح بخاری کتاب النکاح، جلد ششم صفحہ 130)

ہمارے اور آپ کے کام کی چیز اسی ایک جملہ سے ہے اور اس جملہ سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں طرفین کی رضامندی کے بعد فوراً نکاح ہوجایا کرتا تھا اور شادی بیاہ کی تیاری کے لئے آج کل کی طرح چار چھ ماہ کا انتظار نہیں کیا جاتا تھا اور نہ ہی منگنی وغیرہ کی رسم ادا کی جاتی تھی بلکہ وہ جس حال میں بھی ہوتے اسی حالت میں نکاح ہوجاتا۔ نہ نئی پوشاک کی ضرورت محسوس کرتے اور نہ نئے زیورات کی۔

حضرت ام سلمہؓ کا واقعہ

ام المومنین حضرت ام سلمہؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آنے سے پہلے بیوہ تھیں اور کئی بچوں کی ماں بھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی عدت گزرنے کے بعد جب آپ کے نئے نکاح کا پیغام بھیجا تو انہوں نے عرض کیا کہ اس وقت میرے سرپرستوں میں سے کوئی موجود نہیں ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ تمہارے سرپرستوں میں سے کوئی اس نکاح کو ناپسند کرنے والا بھی نہیں ہے۔ اس پر حضرت ام سلمہؓ نے اپنے لڑکے سے کہا (جو نابالغ تھے) کہ اے عمر اٹھو میرا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کردو۔ تو انہوں نے نکاح کردیا۔ (سنن نسائی جلد ششم صفحہ 81 سے 82)

اس حدیث کے ذریعے یہ سبق ملتا ہے کہ ایک نابالغ لڑکا بھی اپنی ماں کا نکاح کرسکتا ہے اور اس مقصد کے لئے بہت سے لوگوں کو جمع کرنا ضروری نہیں ہے۔ ہاں البتہ دو گواہوں کی موجودگی ضروری ہے۔

نکاح کا ایک انوکھا واقعہ

اس سلسلے میں سب سے زیادہ عجیب وغریب اور انوکھا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابو درداءؓ حضرت سلمان فارسیؓ کے ساتھ ایک قبیلے میں (سلمان فارسی کے لئے) نکاح کا پیغام لے کر گئے اور جس گھر میں رشتہ کرنا تھا اس میں ابو درداءؓ داخل ہوئے جب کہ

سلمان فارسیؓ باہر ہی رہے۔ ابو درداء نے سلمان کے فضائل بیان کئے کہ وہ کس طرح اسلام لائے اور اس سلسلے میں کیا کیا مشقتیں برداشت کریں۔ پھر ان کا پیغام گھر والوں کو پہنچایا کہ وہ آپ کی فلاں لڑکی سے نکاح کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ ہم اپنی لڑکی کا بیاہ سلمان کے ساتھ نہیں کر سکتے مگر ہاں تمہارے ساتھ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ تو اسی وقت گھر کے اندر ہی فوراً نکاح ہو گیا۔ پھر وہ باہر نکلے اور سلمان سے کہا کہ اس موقع پر ایک ایسی بات ہو گئی ہے کہ اس کا ذکر کرتے ہوئے میں شرمندگی محسوس کر رہا ہوں۔ انہوں نے پوچھا کہ آخر بات کیا ہے؟ تو ابو درداء نے واقعہ سنایا۔ اس پر سلمان فارسیؓ نے کہا کہ میں اس بات کا زیادہ مستحق ہوں کہ میں تم سے شرمندگی محسوس کروں کیونکہ پیغام تو میں نے دیا تھا مگر وہ تمہارے مقدر کی چیز تھی (مجمع الزوائد، جلد چہارم صفحہ 275)

یہ واقعہ اسلام میں رسم نکاح کی انتہائی سادگی کی ایک اچھوتی مثل ہے جو اس دور کے مسلم معاشرے کی بھی ایک منہ بولتی تصویر پیش کر رہا ہے۔

ارباب ثروت کے لئے ایک لمحہ فکریہ

اسلامی احکام ہر امیر و غریب کے لئے خیر و برکت کا باعث ہیں۔ اگر اللہ نے کسی کو مال و دولت سے نوازا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ من مانے طور پر دولت لٹانا شروع کر دے اور نتیجے کے طور پر محتاج اور کنگال بن جائے۔ مال و دولت بھی اللہ کی ایک امانت ہے جس کا حساب انسان کو دینا پڑے گا جو لوگ مال و دولت کے نشہ میں خدا کے احکام کو بھول کر بے جا اسراف اور فضول خرچی کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ غلط مثال قائم کر کے غریبوں اور کم حیثیت لوگوں کا جینا دوبھر کر دیتے ہیں۔ لہٰذا اس راہ میں وہ صالح اور دیندار نوجوانوں کو آگے بڑھ کر خرافاتی رسوم کو مٹانے کے لئے کمر بستہ ہو جانا چاہئے ورنہ اس میدان میں کوئی انقلابی تبدیلی نہیں آسکتی۔

اگر صحیح اسلامی طریقے کے مطابق اس قسم کی چند شادیاں ہونے لگ جائیں تو پھر وہ دوسروں کے لئے ایک نمونہ بن سکتی ہیں اور غیر اسلامی طور طریقے خود بخود ختم ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اس نسخے کو آج زمانے کی ضرورت ہے اور یہ عمل پورے مسلم معاشرے کی فلاح و بہبود کا

باعث ہوگا اور اس سے مسلمانوں کا معاشی استحکام بھی ہو سکے گا۔ ظاہر ہے کہ ایک ٹھاٹ باٹ کی شادی پر جو رقم بے جا طور پر صرف کی جاتی ہے اگر وہی رقم کسی صنعت یا کاروبار میں لگائی جائے اور اس سے بے روزگار نوجوانوں کی مدد کی جائے تو مسلمانوں کی معاشی پس ماندگی دور ہو سکے گی۔

سنت رسول ﷺ کا تابناک پہلو

بہر حال مذکورہ بالا واقعات ہمارے سامنے اسلامی معاشرہ اور اسلامی طرز حیات کی ایک صحیح اور سچی تصویر پیش کر رہے ہیں اور موجودہ تاریک رات اور گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ہمیں سنت رسول اور سیرت صحابہ ایک منارۂ نور کی طرح دکھائی دے رہے ہیں جو موجودہ خرافات کی بوجھل زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو آزاد کرا سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کا سادہ ترین طرز عمل موجودہ سسکتی بلکتی انسانیت کے لئے آب حیات کا درجہ رکھتا ہے۔ مگر ضرورت ہے کہ سب سے پہلے اس نسخہ کیمیا پر وہ امت عمل کرے جو اس دین سے اپنی وابستگی کا دعویٰ کرتی ہو۔ اگر آج مسلمان اپنے پیارے نبی کی پیاری سنت پر سچے دل کے ساتھ عمل کریں تو نہ صرف پوری ملت اسلامیہ کی کایا پلٹ ہو سکتی ہے بلکہ دنیائے انسانی اسلام کے معجزانہ ہدایت اور اس کی معجزانہ سچائی کا بھی بخوبی نظارہ کر سکتی ہے لیکن اگر خود مسلمان ہی سنت رسول کا انکار کر دیں یا اس پر عمل سے بچنے کے لئے لنگڑے بہانے ڈھونڈنے لگ جائیں تو پھر ہم کس منہ سے لوگوں کو اسلام کی دعوت دے سکتے ہیں اور کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ اسلام ایک خوبیوں والا دین اور سادہ و آسان مذہب ہے جسے اختیار کرو؟ دوسروں کو دعوت دینے سے پہلے اپنے مذہب پر خود عمل کر کے دکھانا چاہئے۔ ورنہ یہ بات ہمارے فکر و عمل کے تضاد کو ظاہر کرنے والی ہوگی۔

مہر ادا نہ کرنا ایک بدترین جرم

خلاصہ یہ کہ نکاح کی ضروری شرائط صرف دو ہیں۔ دو گواہوں کی موجودگی اور ایجاب و قبول۔ لیکن اگر نکاح کا اعلان عام ہو جائے تو یہ بات معاشرتی اعتبار سے زیادہ بہتر ہے مگر

وہ شرط نہیں ہے۔ اسی وجہ سے نکاح مسجد میں کرنا مسنون قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس سے اعلان عام خود بخود ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ خطبہ نکاح مستحب ہے ضروری نہیں۔ اب رہا مہر تو اس کے تعین کے بغیر بھی اگرچہ نکاح تو صحیح ہو جاتا ہے مگر وہ ساقط نہیں ہوتا، بلکہ مہر مثل دینا پڑتا ہے۔

مہر عورت کا ایک شرعی حق ہے جو ہر حال میں فرض ہے اور جو لوگ اسے ادا نہیں کرے وہ گنہگار ہیں اور جو ادا کرنے کی سرے سے نیت نہیں رکھتے وہ ازروئے حدیث زانی ہیں جیسا کہ متعدد حدیثوں سے یہ بات ثابت ہے مثلاً ایک حدیث ملاحظہ ہو۔

ايما رجل تزوج امراةً علی صداق و لا يريد ان يعطيها فهو زان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی عورت سے کچھ مہر کے بدلے نکاح کرتا ہے مگر وہ اسے ادا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تو وہ زانی ہے (سنن کبریٰ جلد ہفتم صفحہ 241)

موجودہ دور کے مسلمانوں پر افسوس ہوتا ہے کہ وہ غیر ضروری رسوم اور خرافات پر روپیہ پیسہ خوب پانی کی طرح بہاتے ہیں مگر اپنی بیوی کا شرعی حق ادا نہیں کرتے اور پھر ایسی صورت میں جبکہ اس کی ادائیگی کی تاکید خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جگہ جگہ فرمائی ہے۔ تو اب اس سے بڑا المیہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی شریعت سے تو کامل غفلت برتی جائے اور غیر قوموں کے رسم ورواج یا "سنت اغیار" سے محبت کی جائے؟ کیا سنت رسول کے مقابلے میں ہمیں سنت اغیار زیادہ پسند ہے۔ آخر کیوں؟؟؟ مگر اس کے باوجود بھی ہم خود کو رحمت الٰہی کا مستحق سمجھتے ہیں۔ اس دورنگی کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

ولیمہ اور نکاح کی دعوت

ولیمہ کرنا فرض یا واجب نہیں بلکہ صرف مستحب یا زیادہ سے زیادہ سنت ہے اور پھر ولیمے میں گوشت روٹی یا بریانی کھلانا بھی ضروری نہیں بلکہ سنت رسول کے مطابق کھجور (یا ستو) یا کوئی بھی چیز کھلا دینا یا صرف شربت پلا دینا بھی کافی ہو جائے گا اور اس قسم کا اہتمام لڑکے والوں کی طرف سے ہونا چاہئے نہ کہ لڑکی والوں کی طرف سے۔ مگر ہم سنت رسول کو

ترک کر کے "سنت اغیار" کی محبت میں لڑکی والوں کی دعوت زبردستی وصول کرتے ہیں اور وہ بھی کئی وقت کی مرغن اور انواع واقسام کی غذاؤں کے ساتھ اور اگر اس میں کوئی کسر رہ جائے تو انہیں ہزار صلواتیں سنائی جاتی ہیں۔ نکاح تو نکاح بعض لوگ اس قسم کے معاملات میں اتنی سختی برتتے ہیں کہ اگر لڑکی والے منگنی تک کے موقع پر بھی ڈھیر سارے مہمانوں کو دعوت کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو رشتہ توڑ دیا جاتا ہے حالانکہ لڑکی والے اس قسم کی دعوتیں کرنے اور باراتیوں کو کھانا کھلانے کے شرعاً مکلف نہیں ہیں۔ لیکن ہم نے اپنی جہالت کی بنا پر شریعت کے مقابلے میں ایک نئی شریعت ایجاد کر لی ہے اور یہ ہمارے باپ دادا کی شریعت ہے جو غیروں سے مستعار لی ہوئی ہے لیکن اگر ہمیں اسلامی شریعت سے واقعی محبت ہے تو پھر ہمیں اپنے باپ دادا کے رسم ورواج اور غیر قوموں کی نقالی کو ترک کر کے اللہ اور اس کے رسول کی مرضی کے مطابق صحیح طریقہ اختیار کرنا پڑے گا، جس میں ہم سب کی نجات ہے۔

لڑکی والوں کی دعوت ناجائز کیوں؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ لڑکی والے اگر نکاح کے موقع پر اپنی خوشی سے دعوت کر دیں تو اس میں کیا برائی ہے اور شرعی اعتبار سے اس کی ممانعت کی دلیل کیا ہے؟ تو اس مسئلے کے دو پہلو ہیں: پہلا یہ کہ اگر ایسا کھانا لڑکے والوں کے مطالبہ پر ہو تو وہ صاف طور پر "اکل باطل" ہے جس کی ممانعت قرآن مجید میں آئی ہے۔ (سورۃ نساء آیت 29) چنانچہ اس آیت کے مطابق لوگوں کا مال ناحق کھانا ممنوع قرار دیا گیا ہے اور مفسرین نے تصریح کی ہے کہ بغیر کسی معاوضہ کے کسی کا مال کھانا بھی اکل باطل میں شامل ہے پھر چونکہ شریعت نے شادی بیاہ کے اخراجات مرد پر عائد کئے ہیں عورت پر نہیں اس لئے لڑکی والوں سے اس قسم کا مطالبہ کرنا شرعاً ناجائز ہے اور پھر سنت رسول یا سنت صحابہ سے بھی اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اسلامی دور میں لڑکی والوں نے کبھی نکاح کی دعوت کی ہو بلکہ اگر ثبوت ملتا ہے تو صرف ولیمے کا جو مرد کی طرف سے کیا جاتا ہے اور یہ بات عقلی اعتبار سے بھی صحیح ہے کیونکہ لڑکی لڑکے کا گھر بسانے کے لئے لڑکے کے یہاں جاتی ہے نہ کہ لڑکا لڑکی کا گھر بسانے کے لئے لڑکی کے یہاں جاتا ہے۔ اس لئے نظام فطرت کی رو سے جب اس کا فائدہ مرد کو مل رہا

ہے تو اس کے اخراجات بھی اسی کو برداشت کرنے پڑیں گے۔

اب رہا دوسرا پہلو کہ اگر لڑکی والے بغیر کسی مطالبہ کے اپنی خوشی سے دعوت کردیں تو اس میں کیا برائی ہے؟ تو اس طرح کہہ دینا بظاہر ایک آسان بات معلوم ہوتی ہے مگر وہ درحقیقت بجائے خود بہت سی برائیوں کا مجموعہ ہے مگر اس موقع پر تین باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ پہلی بات یہ کہ اگر لڑکی والے اس قسم کا کھانا اپنی خوشی سے ہی کیوں نہ کھلائیں تب بھی وہ لڑکی والوں پر خلاف شرع ایک بوجھ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اگرچہ وہ بظاہر خوش دلی سے کھلاتے ہوئے دکھائی دیتے ہوں مگر دل ہی دل میں کڑھ رہے ہوں۔ سوال یہ ہے کہ جب شریعت نے اس قسم کی گنجائش ہی نہیں رکھی ہے تو پھر ہم اس کی گنجائش کیوں نکالیں؟ دوسری بات یہ کہ جب کچھ لوگ محض خوش دلی ہی سے سہی جب کوئی کام شروع کرتے ہیں تو وہ بعد والوں کے لئے ایک مثال اور ایک ”روایت“ بن جاتا ہے اور لوگ عام طور پر اپنے بزرگوں کی روایات پر عمل کرنا اور اس کے لئے کوئی بھی مشکل گوارا کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا بات جب یہاں تک پہنچ جائے تو معاملہ محض خوش دلی کا نہیں رہ جاتا۔ اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ نکاح کی موجودہ دعوتیں اول اول کسی نے بغیر کسی جبر کے خوش دلی سے کھلائی ہوں گی۔ مگر آج معاملہ محض خوش دلی کا نہیں رہ گیا ہے بلکہ اسے فرض وواجب کا درجہ دیا گیا ہے۔ اگر کوئی غریب آدمی اپنی لڑکی کے نکاح کے موقع پر دعوت نہ کرے تو نہ صرف اس نکاح کو ادھورا سمجھا جاتا ہے بلکہ اسے نکھٹو اور نکما تک قرار دیا جاتا ہے۔ گویا کہ اس سے کوئی بہت بڑا گناہ سرزد ہوگیا ہو۔

تیسری بات یہ کہ اگر اس طرح ہر شخص کو چھوٹ دے دی جائے کہ اگر کوئی چاہے تو اپنی خوشی سے دعوت کرے اور اگر نہ چاہے تو نہ کرے تو اس کے نتیجے میں ہمارا معاشرہ واضح طور پر دو طبقوں میں بٹ جائے گا اور بعض نئے سماجی مسائل پیدا ہوجائیں گے۔ چنانچہ لوگ عموماً دعوت کرنے والوں کی تعریف وتوصیف کرتے اور نہ کرنے والوں پر طعنے کستے رہیں گے۔ اس طرح استطاعت نہ رکھنے والے ہمیشہ احساس کمتری میں مبتلا رہیں گے۔

ان کے علاوہ اور بھی کئی طرح کی خرابیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ایسے تمام غیر شرعی رسوم ورواجات کو ختم کرکے ہزاروں لاکھوں بندگان خدا کو راحت پہنچائی

جائے جو زمانے کے بے رحم ہاتھوں میں پھنس کر اپنی قسمت کو کوس رہے ہیں اور جن کے گھروں میں دو چار لڑکیاں موجود ہیں وہ تو گویا کہ زندہ درگور ہیں۔

نکاح کی محفلیں تمام برائیوں کی جڑ

یوں تو غیر قوموں کی نقالی میں ہم نے شادی بیاہ کے بہت سے رسوم وخرافات اپنا رکھے ہیں، مگر اس سلسلے میں سب سے بڑا منکر نکاح کے لئے خصوصی محفلوں کا انعقاد اور دور ونزدیک کے سینکڑوں لوگوں کا اکٹھا ہے اور حقیقتاً اسی ایک چیز نے بہت سی خرافات کو جنم دیا ہے۔ شرعی اعتبار سے اس قسم کی محفلوں کے انعقاد کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور نہ لوگوں کا میلہ ٹھیلہ کرنے کا کوئی ثبوت ہے۔ اسی طرح دور ونزدیک کے رشتہ داروں ہی کو نہیں بلکہ تمام دوست واحباب کو اکٹھا کرنا اور اس مقصد کے لئے قیمتی رقعہ جات چھاپنا، آراستہ وپیراستہ فرنیچر اور شامیانوں کا انتظام اور پرتکلف کھانوں سے ان کی خاطر تواضع سب بلاوجہ تکلفات ہیں جو اکثر وبیشتر اسراف وتبذیر کی حدوں کو چھولیتے ہیں۔

نکاح تو چند مخصوص لوگوں کی موجودگی میں ہونا چاہئے اور اس مقصد کے لئے خصوصی محفلوں کا انعقاد غیر ضروری ہے۔ ہاں البتہ ولیمے میں حسب حیثیت چند عزیز واقارب کو بلایا جاسکتا ہے نہ کہ نکاح میں شرکت کے لئے۔ چنانچہ راقم الحروف کے نقطہ نظر سے نکاح میں شرکت کی دعوت ہی سرے سے غیر اسلامی ہے اور شرعاً اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ واضح رہے عہد رسول اور عہد صحابہ میں محض نکاح میں شرکت یا اسے دیکھنے کے لئے لوگوں کو بلایا نہیں جاتا تھا بلکہ حاضرین کی موجودگی میں (مسجد کے اندر) یہ کارروائی انجام دی جاتی تھی۔ البتہ نکاح کے بعد ولیمے کے لئے بعض مخصوص لوگوں کو (تمام کو نہیں) بلانے کا ثبوت ملتا ہے جیسا کہ متعدد حدیثوں سے ان مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔

لہٰذا اگر نکاح کی محفلوں کو ختم کردیا جائے (جو عجمی دور کی نشانی اور غیر قوموں کی نقالی کی علامت ہیں) تو پھر اس سلسلے کے سارے غلط اور غیر شرعی رسوم وخرافات بھی خود بخود ختم ہوسکتے ہیں۔ یعنی نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔

ولیمے کے بعض مسائل

نظام فطرت کے مطابق نکاح کا فائدہ چونکہ مرد کو حاصل ہوتا ہے اس لئے اس موقع پر خوشی کا اظہار کرنا مرد ہی کا ذمہ ہے۔ مگر اس کا اظہار اپنی طاقت سے بڑھ کر کرنا بھی خلاف شریعت ہے۔ خود آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات کے لئے ولیمہ نہایت درجہ سادگی کے ساتھ کر کے پوری امت کے لئے ایک نمونہ پیش کیا ہے کہ اس میں گوشت روٹی کا ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ صرف کھجور اور پنیر وغیرہ سے بھی ولیمہ ہو سکتا ہے۔

چنانچہ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعض ازواج کے لئے ولیمہ میں صرف "حیس" پیش کیا تھا۔ یعنی کھجور اور پنیر گھی کے ساتھ (مسند احمد جلد سوم صفحہ 99)

اسی طرح ایک اور حدیث کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعض بیویوں کے لئے ولیمہ صرف دو مد جو سے کیا تھا۔ (صحیح بخاری کتاب النکاح جلد ششم صفحہ 143)

دو مد کا مطلب ہے تقریباً ڈیڑھ کلو۔ ظاہر ہے کہ ڈیڑھ کلو جو میں کتنی روٹیاں تیار ہوئی ہوں گی اور کتنے لوگ کھائے ہوں گے۔ اسی طرح ایک مرتبہ ایک صحابی نے اپنے ولیمے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدعو کیا اور اس میں آپ کو صرف کھجور کا شربت پیش کیا (صحیح بخاری، جلد ششم صفحہ 145)

حضرت علیؓ کا نکاح جب حضرت فاطمہؓ سے ہوا تو ان کے ولیمے میں صرف کھجور اور منقیٰ پیش کیا گیا اور سادہ پانی پلایا گیا۔ (سنن ابن ماجہ جلد اول صفحہ 616)

اور پھر اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ولیمے میں پورے محلے یا پورے گاؤں والوں کو بلانا ضروری نہیں بلکہ صرف چند مخصوص لوگوں کو بلایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر آپ نے اپنے خادم خاص حضرت انسؓ کو اسی طرح کا حکم دیا تھا کہ جا کر فلاں فلاں کو بلا لاؤ۔ (صحیح بخاری جلد ششم صفحہ 140)

کیا اس سنت رسول میں ہمارے لئے کوئی نمونہ نہیں ہے؟ یہ حدیثیں ہم کو کیا بتا رہی

ہیں اور آج ہم کیا کر رہے ہیں؟ یہ حدیثیں بتا رہی ہیں کہ کسی مشقت میں پڑے بغیر وقت پر ہم کو جو بھی میسر آ جائے اس سے ہم خوشی کا اظہار کر سکتے ہیں۔ مگر واضح رہے ولیمہ کرنا فرض یا واجب نہیں بلکہ بعض آئمہ کے نزدیک صرف مستحب اور بعض کے نزدیک سنت ہے۔ (فتح الباری جلد نہم صفحہ 230)

حاصل یہ کہ ولیمہ کرنا اول تو کوئی لازمی چیز نہیں اور کرنا ہی ہے تو پھر اس کے لئے تمام لوگوں کو بلانا بھی ضروری نہیں بلکہ صرف چند مخصوص لوگوں کو بلایا جا سکتا ہے اور سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس کے لئے بریانی اور فرنی وغیرہ کا ہونا ضروری نہیں بلکہ صرف شربت یا چائے اور بسکٹ وغیرہ سے بھی ولیمہ ہو سکتا ہے۔

ایک اور رسم کی اصلاح

آج کل نکاح کے موقع پر دعوت کے علاوہ لوگوں کے ہاتھوں میں بادام اور کھجور کا ایک ایک پیکٹ تھمانے کا بھی رواج پڑ گیا ہے اور اسے فرض اور واجب سے بھی بڑا درجہ دے دیا گیا ہے۔ معلوم نہیں اس رسم کا اجرا کب اور کیسے ہوا؟ صحیح احادیث میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ بعض ضعیف احادیث میں بعض میوے لٹانے کا تذکرہ موجود ہے مگر اس قسم کی احادیث کے بارے میں علامہ حافظ نور الدین ہیثمیؒ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ حدیثیں ضعیف بلکہ موضوع ہیں۔ (دیکھئے مجمع الزوائد جلد چہارم 56 اور 290)

لہٰذا اس رسم کی کوئی اصل نہیں ہے اور پھر نکاح کی دعوت (ولیمے) کے ساتھ ساتھ اس رسم کا وجود نہ صرف ایک زحمت ہے بلکہ وہ غریب اور متوسط گھرانوں کے لئے ایک عذاب سے کم نہیں ہے کیونکہ لوگوں کے ذہنوں میں یہ غلط تصور جاگزیں ہو گیا ہے کہ بادام اور کھجور کے بغیر گویا کہ نکاح ادھورا رہتا ہے۔ لہٰذا اس غلط تصور کی اصلاح ضروری ہے۔ اب اصلاح کی دو صورتیں ہیں: (1) یا تو کھجور یا کسی بھی قسم کے میوے کو ولیمے کا قائم مقام قرار دیتے ہوئے ولیم کی دعوت کو سرے سے ختم کر دیا جائے جیسا کہ حضرت علیؓ کے ولیمے میں صرف کھجور اور منقیٰ کھلائے جانے کا ثبوت ملتا ہے اور اس میں بادام اور مصری کا شامل ہونا ضروری نہیں ہے۔ نیز اسی طرح خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض ولیموں میں لوگوں

کی خاطر تواضع صرف کھجور اور پنیر سے کی تھی۔ یا پھر ہلکی سی دعوت یا چائے اور بسکٹ کے ذریعے ولیمہ کر کے بادام اور کھجور کے رواج کو سرے سے منسوخ کر دیا جائے۔

بہر حال ان دونوں میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ یہ نہیں کہ دونوں چیزوں کو ضروری اور واجب قرار دے کر لوگوں کو خواہ مخواہ مصیبت میں ڈالا جائے جبکہ شریعت میں ان چیزوں کی کوئی اصل نہیں ہے۔ اس سلسلے میں دوست واحباب اور رشتہ داروں کو چاہئے کہ وہ اپنے رویہ کی اصلاح کرتے ہوئے لڑکے والوں کو خواہ مخواہ پریشان نہ کریں اور بلاوجہ نکتہ چینی کر کے ان کے لئے مشکلات پیدا نہ کریں۔

اپنی مدد آپ

اسلامی شریعت انتہائی معقول اور سادہ ہے، جو ہر خاص وعام کے لئے قابل عمل ہے۔ مگر ہم نے اپنی جہالت کی بنا پر خود اپنی قبر کھود لی ہے اور شادی بیاہ کو ایک انتہائی مہنگی اور مشکل ترین چیز بنا کر رکھ دیا ہے اور اب ہم پر وہی مثل صادق آرہی ہے کہ "نہ نو من تیل جلے گا اور نہ رادھا ناچے گی۔" ظاہر ہے کہ یہ اپنے ہی کئے کی سزا ہے۔ اگر ہم کو اس مصیبت سے باہر نکلنا ہے تو پھر ہمیں شریعت کی آواز پر کان دھرنا اور اسلامی قانون کی سادگی کو اپنانا ہوگا۔ مگر اس کے لئے سب سے پہلے اپنے باپ دادا کے مسرفانہ اور تباہ کن رسم ورواج یا غیر قوموں کی خود ساختہ شریعت کو طلاق دینا پڑے گا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ غیر قوموں کی نقالی اور "سنت اغیار" سے چمٹے رہنے کی صورت میں اسلام اور اسلامی شریعت ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے اور آپ اس خود اختیار کردہ بیچارگی اور مظلومیت کے لئے اللہ کو مدد کے لئے پکارنا ایک مہمل اور مضحکہ خیز بات ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ صرف انہی کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرنا جانتے ہوں۔ لیکن اس کے برعکس وہ ان لوگوں کی کوئی مدد نہیں کرتا جو اپنی مدد آپ کرنا نہیں جانتے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ: اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت نہ بدلیں۔ (سورۃ رعد 13 آیت 11)

اس حقیقت کو علامہ اقبال نے اس طرح بیان کیا ہے۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال اپنی حالت کے بدلنے کا

معاشرہ کے بچاؤ کا واحد راستہ

حاصل بحث یہ کہ نکاح کا بنیادی مقصد ایک نئے خاندان کی تعمیر وتشکیل ہے۔ لہٰذا اگر ایک نئے گھر کی بنیاد رکھنے کے لئے دوسرے گھر یا دوسرے خاندان کو برباد کر دیا جائے تو یہ ایک غیر معقول بات ہوگی اور شریعت کی نظر میں بھی اسے جواز حاصل نہ ہو سکے گا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہر شخص شادی بیاہ کے موقع پر اتنا ہی خرچ کرے جتنا کہ وہ کسی مشقت میں پڑے بغیر یا مقروض بنے بغیر خرچ کر سکتا ہو۔ مگر غریب اور متوسط گھرانوں میں آج شادی رحمت نہیں بلکہ ایک بہت بڑی زحمت بن کر آتی ہے بلکہ شادی بیاہ کے نام ہی سے ان طبقات میں لوگوں کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں اور انہیں الرجی ہو جاتی ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ موجودہ سماج کا بگاڑیادہ نمائشی معیار ہے جسے خوشحال طبقے نے قائم کر کے عوام کا ذہن ومزاج ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ چنانچہ مالدار طبقے کی نقالی اور ریس میں آج پورا معاشرہ آنکھیں بند کر کے بگٹٹ دوڑ رہا ہے۔ اس طرح امیروں کی لگائی ہوئی اس آگ میں آج پوری قوم جل رہی ہے اور ہر طرف ہاہا کار مچی ہوئی ہے۔ لہٰذا امیر اور مالدار لوگ اپنی یہ نمائشی زندگی بند کر کے قوم اور معاشرہ کو تباہی سے بچائیں۔ تباہی تو بہت زیادہ ہو چکی ہے اس لئے اب ہم کو مرہم تلاش کرنا ہے۔

جب شریعت پر عمل کرنے کی بات آتی ہے تو ضروری ہے کہ ہم اللہ کے احکام پر پورے خلوص اور صدق دل کے ساتھ عمل کریں اور اس کی مرضی میں اپنی مرضی کو ملا دیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ہم سے مطالبہ یہ ہے کہ ہم اللہ کے دین میں کامل طور پر اور پوری طرح داخل ہو جائیں۔ یہ نہیں کہ ہم نماز روزے کی حد تک اللہ کی تو عبادت کریں مگر اپنے معاشرتی وتمدنی معاملات میں "طاغوت" یا "غیر اللہ" کی اطاعت کرنے لگ جائیں۔ یعنی یہ بھی خوش رہے اور وہ بھی۔ تو ظاہر ہے کہ یہ اللہ واحد کی پرستش نہیں ہوئی بلکہ اس میں طاغوت اور

اپنی نفسانی خواہش کا بھی حصہ لگ گیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا مطالبہ تو یہ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً: اے مسلمانو تم اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 208)

فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ: تو جس کسی نے طاغوت (صراط مستقیم سے برگشتہ کرنے والی قوتوں) کا انکار کیا اور اللہ پر (پوری مضبوطی کے ساتھ) ایمان لے آیا تو اس نے ایک مضبوط سہارا حاصل کر لیا۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 256)

امت مسلمہ کو اللہ تعالیٰ نے عالم انسانی کی قیادت کے لئے پیدا کیا ہے اور اس کا کام دنیا کو جگانا اور اس کے بگڑے ہوئے عقائد و اعمال کی اصلاح کرنا ہے۔ مگر عالم انسانی کی قیادت سے پہلے خود اپنے گھر کی اصلاح ضروری ہے۔ لہٰذا مسلمان غیر قوموں کی نقالی اور ان کے خرافات سے باز آ جائیں جن میں دین و دنیا دونوں کی تباہی ہے۔

سادہ نکاح کے دو نمونے

اس سلسلے میں راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ جب تک خواص کوئی اصلاحی قدم نہ اٹھائیں عوام کی اصلاح ہونا بہت مشکل ہے۔ لہٰذا خواص کو ہر قسم کے خرافات سے اجتناب کرتے ہوئے اسلامی طریقے کے مطابق اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی پوری سادگی کے ساتھ انجام دینی چاہئے۔ چنانچہ اسی جذبہ کے تحت راقم الحروف نے اپنے بڑے لڑکے اور اپنی ایک لڑکی کی شادی نہایت درجہ سادگی کے ساتھ کرتے ہوئے لڑکے کے ولیمے میں لڑکی کی رخصتی کر دی۔ اس طرح لڑکی کے نکاح کے موقع پر دعوت کرنے کی بدعت سے صاف بچ گئے اور پھر مزید یہ کہ بادام اور کھجور تقسیم کرنے کی حماقت بھی نہ کی کیونکہ ولیمے کی دعوت کر دی تھی۔

اس کے برعکس اپنی ہی ایک دوسری لڑکی کا نکاح ہوا تو ہم نے پہلے ہی شرط کر لی تھی کہ ہمارے یہاں بارات نہیں آئے گی اور نہ ہم باراتیوں کو دعوت کریں گے۔ تو مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ نکاح کہاں اور کیسے ہو اور لڑکی کی رخصتی کس طرح عمل میں آئے؟ تو اس کا حل یہ نکالا گیا

کہ نکاح کسی مسجد میں ظہر کی نماز کے بعد کر دیا جائے اور عصر بعد چند مخصوص لوگ آ کر لڑکی کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ اس طرح یہ قضیہ بحسن وخوبی ختم ہوا۔ اس واقعہ کا سب سے زیادہ خوشگوار اور لوگوں کے لئے حیرتناک پہلو یہ تھا کہ اپنے گھر میں سوائے لڑکی کی رخصتی کے کسی بھی قسم کی تقریب نہیں ہوئی اور نہ اپنے کسی رشتہ دار کو مدعو کیا گیا۔ البتہ دوسرے دن لڑکے والوں کی دعوت پر ولیمے میں اپنے بھی چند عزیز و اقارب مدعو تھے۔ کچھ رشتہ داروں نے اس کا گلہ ضرور کیا مگر سب اس اصلاحی اقدام کو سراہنے اور اس کی تعریف کرنے لگے۔

نیز ہم نے جوڑے گھوڑے اور جہیز کے موجودہ رواج کو ترک کرنے کی غرض سے سخت قدم اٹھاتے ہوئے ان خرافات کو مکمل طور پر مسترد کر دیا بلکہ راقم سطور نے ایسی کئی شادیوں کا بھی بائیکاٹ کیا جن میں لڑکی والوں کی طرف سے کھانا کھلایا جا رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہمارے خاندان میں یہ اصلاحی تحریک آہستہ آہستہ زور پکڑ رہی ہے اور لوگ سنت طریقوں کو اپنانے کے شیدائی نظر آنے لگے ہیں۔ لہٰذا اگر ہم ارادہ کر لیں تو پھر پوری دنیا کو بدل سکتے ہیں۔ اصل چیز ارادہ ہی ہے اور ارادہ ہی وہ قوت ہے جو ایک نئے دور اور ایک نئے انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ اگر ارادہ نہ ہو تو پھر ایسی کسی قوم کو دنیا کی کوئی طاقت بدل نہیں سکتی بلکہ وہ ہمیشہ زوال و ادبار کی چکی میں پستی رہے گی اور موت کے پنجے سے کبھی باہر نکل نہ سکے گی۔ ان معاملات میں مردوں سے زیادہ عورتوں کی اصلاح بہت ضروری ہے کیونکہ مختلف رسوم کی ادائیگی کے لئے مردوں کو اکسانے والی وہی ہوتی ہیں۔ اگر عورتیں قابو میں آ جائیں تو پھر ہر مسئلہ آسان ہو سکتا ہے۔

آئیے عہد کریں

لہٰذا آئیے ہم اللہ سے عہد کریں کہ آج سے ہم تمام غیر شرعی رسوم اور غیر قوموں کے مسرفانہ اور تباہ کن رواجوں کو ترک کر کے اسلامی شریعت کے مطابق:

1- نکاح پوری سادگی کے ساتھ انجام دیں گے؟

2- نکاح کے لئے خصوصی محفلیں منعقد کر کے اس کی نمائش نہیں کریں گے؟

3- لڑکی والوں کی دعوت نہیں کھائیں گے؟

4- وہ بہ حسب استطاعت مختصر اور سادہ طور پر کریں گے؟

5- نکاح اور ولیمے کے موقع پر میلہ ٹھیلہ نہیں کریں گے؟

6- دولت کی بے جا نمائش کر کے دوسروں کے لئے غلط مثال قائم نہیں کریں گے؟

7- جوڑے جہیز کا غیر معقول مطالبہ کر کے لڑکی والوں کے ناک میں دم نہیں کریں گے؟

8- کسی بھی قسم کی غیر شرعی رسم کی ادائیگی پر اصرار نہیں کریں گے؟

9- جہاں تک ہو سکے غیر اسلامی رسوم سے بچنے کی کوشش کریں گے؟

10- اسلامی قانون و شریعت کا احترام کرتے ہوئے اس کی بالادستی کو ہر حالت میں قائم رکھنے کی کوشش کریں گے۔

جب ہم صدق دل سے یہ عہد کرتے ہوئے پورے خلوص کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہو جائیں گے تو اس کے ثمرات بھی بہت جلد نکلنے شروع ہو جائیں گے اور مسلم معاشرہ نہ صرف سکون کا سانس لے گا بلکہ اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں بھی ضرور نازل ہوں گی مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس نسخے کو آزمائیں۔

اسلام میں مہر کی حقیقت

اسلامی شریعت نے عورت سے جسمانی طور پر مستفید ہونے کے لئے مرد پر ایک معقول معاوضہ عائد کیا ہے جسے فقہی اصطلاح میں مہر کہا جاتا ہے اور اس کی ادائیگی شوہر کے ذمہ واجب قرار دی گئی ہے۔ یہ اسلامی شریعت کا ایک خصوصی امتیاز ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں نکاح کے موقع پر عورت کو مہر کے نام سے ایک معقول رقم دلاتی ہے اور اس پر اسے پورے پورے مالکانہ حقوق عطا کرتی ہے۔

مہر کے نام سے عورت کو جو تھوڑی بہت رقم ملتی ہے وہ اس کی خدمات کا پورا پورا صلہ تو نہیں ہو سکتی، ہاں البتہ اس کی وحشت دور کرنے کی راہ میں ایک درجہ میں باعث اطمینان ہو سکتی ہے۔ شریعت نے اگرچہ کم سے کم مہر کی کوئی مقدار مقرر نہیں کی مگر زیادہ کی حد بھی مقرر نہیں کی ہے اور اس میں حکمت عملی یہ معلوم ہوتی ہے کہ مہر مرد کے مالی و اقتصادی حالت کے

مطابق ہو۔ لہٰذا اگر کوئی صاحب حیثیت اپنی منکوحہ کو ہزاروں بلکہ لاکھوں روپے بھی دے دے وہ جائز ہوگا کیونکہ قرآن مجید میں ایک ڈھیر سامال دینے کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ (سورۃ النساء: آیت 20)

مہر کی فرضیت

مہر کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اسے بعض جگہ "فریضہ" یعنی ایک فرض کی ہوئی چیز قرار دیتے ہوئے اس کی ادائیگی کی تاکید کی ہے۔

"جن عورتوں سے تم لطف اندوز ہو چکے ہو ان کے مقرر شدہ معاوضے انہیں دے دو۔" (سورۃ النساء آیت 24)

پھر چونکہ اس آیت میں مہر کو اجر یا معاوضہ کہا گیا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ بھی ہوا کہ نکاح کا معاہدہ "ایک اجرت" کے عوض میں وجود میں آتا ہے، اسی وجہ سے اسے "حق بضع" بھی کہا گیا ہے۔ یعنی عورت کی شرمگاہ کو حلال کیے جانے کا حق۔

غرض قرآن مجید میں جگہ جگہ عورتوں کا مہر خوش دلی کے ساتھ ادا کرنے کی تاکید آئی ہے اور حدیث نبوی میں مذکورہ بالا آیت کریمہ کی شرح و تفسیر اسی طرح ملتی ہے۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مرد نے نکاح کے بعد عورت سے صحبت کر لی ہے تو اسے مہر دینا پڑے گا، عورت کی فرج حلال کرنے کی وجہ سے۔" (سنن داری جلد دوم صفحہ 137)

نیز ایک دوسری حدیث میں ہے۔ "جس کسی نے منکوحہ عورت کا کپڑا کھولا اور اس کی پوشیدہ چیز کی طرف نظر ڈالی تو مہر واجب ہو گیا۔" (کنز العمال شانزدہم صفحہ 323)

یہ ہے اسلامی شریعت میں مہر کی اہمیت اور اس کی تاکید۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمان موجودہ دور میں اس فرض چیز کو ادا نہیں کرتے بلکہ اس کی ادائیگی سے غفلت برتتے ہوئے نکاح کے موقع پر فضول چیزوں بلکہ خرافات میں ہزاروں لاکھوں روپے برباد کر دیتے ہیں لیکن جس چیز کی شریعت کی نظر میں انتہائی اہمیت ہے وہ ان کی نظر میں غیر اہم بن کر رہ گئی

ہے۔ اس سے بڑھ کر عجیب و غریب بات اور کیا ہو سکتی ہے! ظاہر ہے کہ یہ سب اسلامی شریعت سے غفلت ولاپرواہی اور خدا کے احکام کو بھول جانے کا نتیجہ ہے۔

مہر پیشگی ادا کرنے کی تاکید

اسلامی شریعت کی رو سے اصل ضابطہ یہ ہے کہ مہر جہاں تک ہو سکے پیشگی ادا کر دیا جائے لیکن اگر کسی وجہ سے فوری طور پر ادا کرنا ممکن نہ ہو تو اس کی ادائیگی کی مدت مقرر کر لی جائے۔ یہ نہیں کہ بغیر کسی صراحت کے مہر تو باندھ لیا مگر ادائیگی کی نوبت ہی نہ آئے بلکہ اسے عمر بھر ٹالتے رہے اور پھر مرتے وقت یا تو بخشوا لیا یا جورو کے قرضدار ہو کر مر گئے۔ ایسا کرنا نہ صرف اسلامی قانون کی رو سے سخت گناہ ہے بلکہ وہ ایک مرد کی مردانگی اور اس کی شرافت کے بھی خلاف ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس بات کا بہت زیادہ اہتمام فرمایا کرتے تھے کہ عورت کا مہر جہاں تک ہو سکے نکاح کے موقع پر پیشگی ادا کر دیا جائے کیونکہ مہر اصلاً عورت کی فرج کو حلال کئے جانے کا صلہ ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کا نکاح کرنے سے پہلے ان سے پوچھا کہ مہر میں دینے کے لئے تمہارے پاس کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا: "جاؤ اور کچھ تلاش کرو اگر چہ وہ لوہے کی ایک انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو۔" (صحیح بخاری، جلد ششم صفحہ 138)

اس سے نہ صرف مہر کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے بلکہ اسے پیشگی ادا کرنے کی بھی تاکید نکلتی ہے۔ اسی طرح حدیثوں میں مذکور ہے کہ جب حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ سے نکاح کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ تم فاطمہ کو بطور مہر کوئی چیز دے دو۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ تمہاری وہ حطمی زرہ کیا ہوئی جو میں نے تمہیں فلاں دن دی تھی؟ حضرت علیؓ نے کہا کہ وہ میرے پاس موجود ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ فاطمہ کو وہی دے دو۔ (سنن ابوداؤد، مسند احمد)

عوت جب چاہے مہر طلب کر سکتی ہے

نکاح اگر چہ مہر معجل (پیشگی مہر) کے بغیر بھی صحیح ہو جاتا ہے مگر اس کی مدت مقرر ہونی چاہئے۔ لیکن اگر کوئی شخص مہر معجل ادا نہ کرے اور اس کی مدت بھی مقرر نہ ہو تو عورت کو شرعاً اختیار رہے گا کہ وہ شوہر سے جب چاہے اپنے مہر کا مطالبہ کرے اور اسے یہ بھی اختیار رہے گا کہ وہ اپنا مہر حاصل کئے بغیر اپنے آپ کو شوہر کے حوالے کرنے سے انکار کر دے۔ مگر اس صورت میں شوہر ناراض ہو کر یا طیش میں آ کر اس کا نفقہ بند نہیں کر سکتا۔ کیونکہ نفقہ کا مہر سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ نفقہ صرف عورت کی نافرمانی کی وجہ سے بند کیا جا سکتا ہے لیکن عورت کو اپنے مہر کا مطالبہ کرنا شوہر کی نافرمانی قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ وہ اپنے اس حق کا مطالبہ کر رہی ہے جسے شریعت نے اس کے تحفظ کی خاطر مقرر کیا ہے۔ چنانچہ اس مسئلہ میں فقہاء نے صراحت کی ہے کہ:

"شوہر اگر مہر ادا کر دے تو وہ اپنی بیوی کو اپنے گھر لے جا سکتا ہے۔ اگر عورت اپنے مہر کا مطالبہ کرتے ہوئے اپنے گھر میں رک جائے تب بھی وہ نفقہ کی مستحق ہوگی کیونکہ وہ اپنے حق کی وجہ سے رکی ہوئی ہے۔" (کتاب النفقات)

"عورت کو حق حاصل رہتا ہے کہ وہ اپنا مہر وصول کرنے تک شوہر کو جنسی تعلق اور بوس وکنار سے بھی روکے اور اس کے ساتھ سفر کرنے سے بھی انکار کر دے۔" (درمختار)

مہر ادا نہ کرنے کی نیت کرنے والا زانی

جیسا کہ عرض کیا گیا مہر عورت کا ایک شرعی حق ہے جو اس سے لطف اندوزی کے بدلے میں عائد ہوتا ہے۔ عورت چونکہ فطری وطبعی اعتبار سے ایک کمزور مخلوق ہے جبکہ اس کے برعکس مرد قوی ہیکل اور طاقتور بنایا گیا ہے اس لئے شریعت نے عورت کے تحفظ کی خاطر مرد پر ایک قابل لحاظ مال نکاح کے موقع پر فرض کیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں مردوں کو تاکید ہے کہ وہ نکاح مال کے ذریعے حاصل کریں۔ (سورۃ نساء آیت 24)

اور حدیثوں میں تاکید ہے کہ عورتوں سے لطف صحبت اپنے بہترین مالوں کے ذریعے

ہونا چاہئے۔ (سنن ابوداؤد)

لہٰذا جو شخص قرآن اور حدیث کی ان تاکیدوں کو نظر انداز کرتے ہوئے مہر کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرتا ہے یا سرے سے دینے کی نیت ہی نہیں رکھتا تو ایسا شخص شریعت کی نظر میں خدا کا نافرمان ہی نہیں بلکہ وہ زانی کے حکم میں ہے جیسا کہ مختلف حدیثوں میں صراحت موجود ہے۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی عورت کا مہر مقرر کیا، اس حال میں کہ اللہ اسے بخوبی جانتا ہے کہ اس کی نیت ادا کرنے کی نہیں ہے بلکہ وہ اللہ کو دھوکا دیتا ہے اور اس عورت کی شرمگاہ کو ناحق حلال کرتا ہے تو وہ قیامت کے دن ایک زانی کے روپ میں حاضر ہوگا۔'' (مسند احمد)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی عورت سے نکاح کیا (چاہے مہر کم ہو یا زیادہ) اور اس کے دل میں اس کی ادائیگی کا خیال نہ ہو تو اس نے اس عورت کو دھوکا دیا اور اگر وہ اسے ادا کئے بغیر مرگیا تو وہ اللہ کے سامنے زانی بن کر حاضر ہوگا۔ (مجمع الزوائد، جلد چہارم صفحہ 284)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے نزدیک عظیم ترین گناہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرے مگر جب اپنی ضرورت پوری ہوجائے تو اسے طلاق دے کر اس کا مہر چٹ کرجائے۔'' (مستدرک وسنن کبریٰ)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم قیامت کے دن حقداروں کو ان کے حقوق ضرور ادا کروگے۔ یہاں تک کہ ایک بے سینگ دار بکری کو لایا جائے گا اور اس سے بے سینگ والی بکری کا حق دلایا جائے گا (صحیح مسلم)

کامیاب ازدواجی زندگی کا راز

ایک کامیاب ازدواجی زندگی گزارنے کے لئے مرد اور عورت کے تعلقات کی درستگی اور ان کے روابط کی استواری ضروری ہے اور ان دونوں کی اصلاح سے ایک کامیاب اور مثالی خاندان کی بنیاد پڑتی ہے اور ظاہر ہے کہ خاندانی نظاموں کی درستی ہی سے ایک

کامیاب ومتوازن معاشرہ اور ایک صالح تمدن وجود میں آتا ہے اس اعتبار سے جس معاشرہ کے خاندانی نظامات بگڑ جائیں وہ ابتر و پراگندہ ہوسکتا ہے۔ اسی بنا پر اسلام نے مرد اور عورت کے تعلقات کی درستی اور اصلاح پر بہت زیادہ زور دیا ہے تا کہ مسلم معاشرہ ہر قسم کی افراط وتفریط اور ہر قسم کے نقائص سے پاک رہ کر فطرت کے اصولوں کے مطابق نشوونما پاتا رہے۔

چنانچہ اس موضوع پر حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''حقوق زوجیت'' کے عنوان سے جو کچھ تحریر کیا ہے اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

میاں بیوی کے بندھن کی بنیاد

جان لو کہ میاں بیوی کا بندھن تمام خاندانی روابط میں سب سے بڑا، سب سے زیادہ نفع بخش اور سب سے زیادہ ضرورت کی چیز ہے کیونکہ تمام لوگوں میں خواہ وہ عرب کے ہوں یا عجم کے، سب میں یہی دستور ہے کہ تمدنی معاملات میں انہیں ہمیشہ عورت کی رفاقت و استعانت کی ضرورت لاحق رہتی ہے جو مرد کے لئے کھانے پینے اور لباس کی تیاری میں مدد کرسکے۔ اس کے مال اور بچوں کی حفاظت کرسکے اور شوہر کی غیر حاضری میں اس کی نائب بن کر (اس کے حقوق کی نگہداشت) کرسکے۔ اسی وجہ سے مذاہب وشرائع کی اکثر توجہ اس معاشرتی بندھن کو جہاں تک ممکن ہوسکے باقی رکھنے اور اس کے مقاصد کی وضاحت کرنے کی طرف مبذول رہی ہے۔ جس طرح کہ زندگی کے اس شعبہ کو مکدر یا معطل کرنے کو انہوں نے سخت ناپسندیدہ قرار دیا ہے اور اس بندھن کے مقاصد کو پورا کرنا طرفین کی باہمی محبت و الفت کے بغیر ممکن نہیں اور یہ باہمی محبت والفت چند امور میں مقید ہے۔ جیسے ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی، ایک دوسرے کے ساتھ معافی ودرگزر کا رویہ، ایسی باتوں سے اجتناب جو دلوں میں کدورت وعداوت پیدا کرنے کا باعث ہوں اور ہنسی مذاق اور خوش مزاجی وغیرہ۔ لہٰذا حکمت اس کی مقتضی ہے کہ ان باتوں میں ترغیب دی جائے اور ان کے فوائد کے حصول پر (میاں بیوی کو) ابھارا جائے (تا کہ وہ ازدواجی اعتبار سے ایک کامیاب زندگی گزار سکیں)

مسرت بخش زندگی کا ایک گر

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

استوصو ابالنساء خیرا، فانھن خلقن من ضلع، فان ذھبت تقیمہ کسرتہ و ان ترکتہ لم یزل اعوج :

عورتوں سے اچھا برتاؤ کرو۔ کیونکہ وہ پسلی کی ہڈی سے پیدا کی گئی ہیں (جو ٹیڑھی ہوتی ہے) لہٰذا اگر تم اسے سیدھی کرنا چاہو گے تو اسے توڑ دو گے، اور اگر اسی طرح چھوڑ دو گے تو ٹیڑھی ہی رہے گی۔

مطلب یہ کہ عورت کی فطرت میں کچھ ٹیڑھ پن پیدائشی طور پر ہوتا ہے جو کبھی درست نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ایک ہوشیار مرد وہ ہے جو ایک کامیاب زندگی گزارنے کے لئے عورت کی اس فطرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے نفسیاتی طریقوں سے اس حقیقت کا مقابلہ کرے اور ہمیشہ اس پہلو کو مدنظر رکھے۔ اس لحاظ سے اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ ایک خوشگوار زندگی کے پیش نظر عورت کو کبھی کبھی چھوٹ دے دے اور اس کے بے جا مطالبات بھی مان لے۔ ورنہ زندگی مکدر ہو سکتی ہے۔

(شاہ صاحب تحریر کرتے ہیں) میں کہتا ہوں اس کے معنی یہ ہیں کہ میری نصیحت قبول کرو اور عورتوں کے بارے میں اس پر عمل کرو۔ عورتوں کی فطرت میں کچھ ٹیڑھ پن اور کچھ خامی موجود ہے جو ایک لازمی شے کی طرح عورتوں کی فطرت میں برابر جاری رہتی ہے۔ اس لئے جب کوئی شخص اپنے گھریلو مقاصد کی تکمیل کرنا چاہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ بعض معمولی باتوں سے تجاوز کرے اور اپنی خواہش کے خلاف پائی جانے والی چیزوں پر اپنے غصے کو روکے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

لَا یَفْرَکُ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَۃً اِنْ کَرِہَ مِنْھَا خُلُقًا رَضِیَ مِنْھَا الْآخَرَ:

کوئی مومن مرد کسی مومن عورت سے عداوت نہ رکھے اگر وہ اس کی کسی ایک عادت کو ناپسند کرے گا تو وہ اس کی کسی دوسری عادت سے راضی رہے گا۔

مطلب یہ کہ اگر کسی عورت میں کوئی خامی ہوگی تو اس میں کوئی خوبی بھی ہو سکتی ہے۔

لہٰذا کوئی مرد اپنی عورت کی کسی ایک بات سے ناراض ہوگا تو اس کی کسی خوبی کی وجہ سے راضی اور خوش بھی رہے گا۔ ہر انسان خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی مرد یا عورت صرف خوبیوں ہی کا مجموعہ ہو اور اس میں کوئی خامی سرے سے موجود نہ ہو۔

(شاہ صاحب تحریر کرتے ہیں) میں کہتا ہوں کہ کوئی شخص جب کسی عورت کی کسی عادت کو ناپسند کرے تو اس کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ فوراً طلاق کا ارادہ کر بیٹھے کیونکہ اس صورت میں دیگر بہت سی باتیں ایسی ہو سکتی ہیں جو اس کے لئے مسرت بخش ہو سکتی ہیں، جن کے باعث وہ اس عورت کے ساتھ رہتے ہوئے تھوڑی سی تکلیف برداشت کر سکتا ہے۔

عورتوں کے ساتھ حسن سلوک

اسی وجہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

وَاتَّقُوا اللّٰہَ فِی النِّسَاءِ فَاِنَّکُمْ اَخَذْتُمُوْھُنَّ بِاَمَانِ اللّٰہِ، وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوْجَھُنَّ بِکَلِمَۃِ اللّٰہِ، وَلَکُمْ عَلَیْھِنَّ اَنْ لَّا یُوْطِئْنَ فُرُشَکُمْ اَحَدًا تَکْرَھُوْنَہٗ، فَاِنْ نَعَلْنَ فَاضْرِبُوْھُنَّ ضَرْبًا غَیْلَ مُبَرِّحٍ وَ لَھُنَّ عَلَیْکُمْ رِزْقُھُنَّ وَ کِسْوَتُھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔

تم لوگ عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو۔ کیونکہ تم نے انہیں اللہ کی امانت میں لیا ہے اور ان کی شرمگاہوں کو اللہ کے کلمہ (نکاح کے دو بول) کے ذریعے حلال کر لیا ہے۔ تمہارا حق ان پر یہ ہے کہ وہ تمہارے بستروں پر ان لوگوں کو نہ بٹھائیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو۔ (مطلب یہ کہ وہ ناپسندیدہ مردوں سے نہ ملیں) اگر وہ ایسا کریں تو تم انہیں ہلکی سی مار دو اور ان کا حق تم پر یہ ہے کہ تم ان کے کھانے اور کپڑے کی خبر گیری اچھے طریقے سے کرو۔

واضح رہے اس سلسلے میں واجب اصلی معروف (بھلے) طریقے سے زندگی گزارنا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے۔ **وَ عَاشِرُوْھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ** (سورۃ نساء 4 آیت 19) اور تم عورتوں کے ساتھ بہتر زندگی گزارو۔

اور اس اصول کی تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوراک، پوشاک اور حسن معاملہ کے ذریعے کی ہے، چنانچہ وہ شریعتیں جن کا دارومدار وحی الٰہی پر ہے، ان میں خوراک

اوراس کی مقدار کا تعین کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ مختلف ممالک کے باشندے کسی ایک چیز اور ایک مقدار پر متفق نہیں ہوسکتے اسی وجہ سے اس حکم کو مطلق رکھا گیا ہے۔(حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم صفحہ 135 سے 136)

زندگی جنت بھی جہنم بھی

یہ بیان مختصر ہونے کے باوجود نہایت درجہ حکیمانہ ہے، جس میں روح شریعت کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب زندگی گزارنے کا فلسفہ بھی دلنشین انداز میں سمجھایا گیا ہے۔لہٰذا جو شخص ایک مسرت بخش زندگی گزارنے کا طالب ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ مصنوعی اوبناوٹی طور طریقوں سے کلی طور پر اجتناب کرتے ہوئے زندگی کی اصل حقیقت سمجھنے اور پھر اس کے تقاضوں کے مطابق اپنی زندگی ڈھالنے کی کوشش کرے۔ محض وقتی وعارضی فوائد اور دورِوزہ عیش یا موج ومستی کے لئے اپنی ابدی مسرتوں اور حیات جاودانی کو قربان نہ کرے۔ ورنہ وہ دینی ودنیوی دونوں جہانوں کی سعادتوں سے محروم رہے گا کیونکہ ایک مصنوعی زندگی گزارنے کے چکر میں پڑ کر لوگ نہ صرف اپنی زندگی کو دنیا ہی میں جہنم کا نمونہ بنالیتے اور حقیقی خوشیوں سے محروم رہ جاتے ہیں بلکہ وہ اپنی آخرت بھی خراب کرلیتے ہیں۔یعنی نہ ادھر کے رہے اور نہ ادھر کے۔

میاں بیوی کے حقوق اور فرائض

دنیا میں ایسی بہت سی قومیں پائی گئی ہیں جن میں عورت کا درجہ نہایت درجہ حقیر مانا گیا ہے اور اسے مرد کی ایک کنیز یا داسی قرار دیتے ہوئے اس کے حقوق کو پوری طرح نظر انداز کیا گیا ہے۔اس کے برعکس چودہ سو سال پہلے اسلام نے عورت کو جو حقوق دیئے تھے اور مرد وعورت کے درمیان صحیح حدود قائم کرتے ہوئے ان دونوں پر جو فرائض عائد کئے تھے وہ حد درجہ معتدل اور منصفانہ ہیں۔چنانچہ ایک مثالی معاشرہ کی تعمیر کے لئے عورت اور مرد دونوں کو اپنے اپنے فرائض و واجبات خوش دلی اور ایمانداری کے ساتھ ادا کرنے ضروری ہیں ورنہ معاشرہ پنپ نہیں سکتا۔

معاشرہ کے استحکام کی بنیاد

بہرحال ایک معاشرہ یا سماج کا استحکام خاندانی نظاموں کی مضبوطی کی بدولت ہوتا ہے اور خاندانی نظاموں کی مضبوطی میاں بیوی کے تعلقات پر مبنی ہوتی ہے۔اگر ان دونوں کے تعلقات درست ہوں تو پھر خاندان بھی مضبوط ومستحکم رہتا ہے ورنہ تاش کے پتوں کی طرح بکھر جاتا ہے۔لہٰذا میاں بیوی کے تعلقات کی استواری ہر حال میں ضروری ہے۔یعنی دونوں محبت والفت کی بنیاد پر ایک دوسرے کے حقوق وفرائض پوری ایمانداری اور خوش دلی کے ساتھ ادا کرتے رہیں۔دونوں ایک دوسرے کے خیرخواہ ہوں اور صحیح معنیٰ میں ایک دوسرے کے جیون ساتھی بن کر زندگی کی کشتی کو کھیلنے کی سعی کریں۔

مردوں کی ایک درجہ میں برتری

اسلام کی نظر میں مرد اور عورت دونوں انسان ہونے کی حیثیت سے برابر برابر ہیں لیکن جہاں تک ان کے فرائض وواجبات کا تعلق ہے ان دونوں کا دائرہ کار الگ الگ ہے۔ چنانچہ گھریلو انتظام کے نقطہ نظر سے اسلام نے مرد کو گھر کا ناظم یعنی رکھوالا تسلیم کیا ہے اور اس اعتبار سے وہ عورت کا نگران ومحافظ ہے کیونکہ وہ اپنا مال خرچ کرکے اسے بیاہ کرلاتا ہے اور اس کا مہر اور نفقہ ادا کرتا ہے نیز وہ اس راہ میں ہر قسم کے مصائب برداشت کرتا ہے۔اسی وجہ سے اسلام عورتوں کے برابر کے حقوق دینے کے باوجود مردوں کی برتری ایک درجہ میں تسلیم کرتا ہے۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ص وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ": اورعورتوں کے بھی معروف طریقے سے ایسے ہی حقوق ہیں جیسے ان پر عائد ہوتے ہیں لیکن مردوں کو ان پر ایک درجہ فضیلت ہے۔(سورۃ بقرہ 2 آیت 228)

مرد اور عورت یکساں ذمہ دار

بہرحال مرد اور عورت دونوں اپنے اپنے فرائض وواجبات ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں

بلکہ دنیا میں کوئی شخص اپنی ذمہ داریوں سے آزاد نہیں ہے جیسا کہ ایک حدیث نبوی میں اس کی تصریح کی گئی ہے۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور ہر شخص (قیامت کے دن) اس کی ذمہ داری کے بارے میں جواب دہ ہوگا۔ چنانچہ امام (مسلمانوں کا امیر) بھی ذمہ دار ہے جو اپنی ذمہ داری کے بارے میں جواب دہ ہوگا۔ اسی طرح ہر شخص اپنے اہل وعیال کے بارے میں ذمہ دار ہے جو اپنی ذمہ داری کے بارے میں جواب دہ ہوگا اور عورت بھی اپنے شوہر کے گھر کی ذمہ دار ہے، جو اپنی ذمہ داری کے بارے میں جواب دہ ہوگی۔" (صحیح بخاری جلد اول صفحہ 215)

اس اعتبار سے عورت اسلام کی نظر میں گھر کی خادمہ نہیں بلکہ وہ گھر کی ملکہ ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کے مقام و مرتبہ کو پہچانیں اور ایک دوسرے کے حقوق کو محبت وخلوص کے ساتھ ادا کرتے ہوئے اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔

مرد کے فرائض

اسلام کی نظر میں کامل ایمان والا شخص وہ نہیں ہے جو محض نماز پڑھ لیتا یا روزے رکھ لیتا ہو بلکہ کامل ایمان والا شخص وہ ہے جو کردار اور کیرکٹر کے لحاظ سے اچھا اور بہتر ہو اور کردار و کیرکٹر یا حسن اخلاق کی کسوٹی یہ ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا ہو۔ جیسا کہ اس اصول کی وضاحت حدیث نبوی میں اس طرح کی گئی ہے۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایمان کے اعتبار سے کامل ترین شخص وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں اور تم میں سے بہتر لوگ وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے ساتھ بہتر سلوک کرتے ہوں۔" (جامع ترمذی جلد سوم صفحہ 466)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص اخلاق و کردار میں ناقص و ناکارہ ہے اور جو اپنی منکوحہ کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرتا وہ ایمان میں بھی تہی مایہ ہے۔

عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کا سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ ان کا نان نفقہ (خرچہ) پابندی کے ساتھ ادا کیا جائے اور انہیں بلاوجہ کوئی تکلیف نہ پہنچائی جائے بلکہ جہاں تک

ہو سکے عورتوں کی خاطر و مدارات کی جائے اور ان کے جذبات کا بھی خیال رکھا جائے کیونکہ وہ اپنے شوہروں کے گھروں کو بسانے کی خاطر اپنے عزیز واقارب کو چھوڑ کر چلی آتی ہیں اور اپنا سب کچھ نچھاور کر دیتی ہیں۔

بہر حال ایک مسلمان جب اپنی بیوی کے نفقہ کو بوجھ نہ سمجھتے ہوئے اسے خوش دلی کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے ادا کرتا ہے تو یہ اس کے اجر وثواب کا بھی باعث بن جاتا ہے بلکہ وہ اپنی بیوی کے منہ میں جو لقمہ ڈالے گا اس کے اجر وثواب کا بھی وہ مستحق قرار پائے گا جیسا کہ ارشاد نبوی ہے۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم جو بھی نفقہ اللہ کی رضامندی کی خاطر خرچ کرو گے اس پر تمہیں اجر وثواب ضرور دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ اس لقمے پر بھی جو تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالتے ہو۔" (صحیح بخاری کتاب الایمان جلد اول صفحہ 20)

عورت کے فرائض

اسلام نے نظام فطرت کے مطابق کسب معاش کا فریضہ مرد پر عائد کرتے ہوئے عورت کو گھر کی ملکہ قرار دیا ہے اور اس تقسیم کار کی بنا پر عورت پر دو قسم کی (ذمہ داریاں) عائد کی گئی ہیں کہ وہ مردوں کی اطاعت گزار ہوں اور ان کی غیر حاضری میں ان کے مال و اسباب کی حفاظت کرنے والی ہوں جیسا کہ ارشاد باری ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (سورۃ نساء 4 آیت 34)

مرد عورتوں پر نگران ہیں کیونکہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ مردوں نے (عورتوں پر نکاح، مہر اور نفقہ وغیرہ کی صورت میں) اپنا مال خرچ کیا ہے تو (اس بناء پر) نیک عورتیں وہ ہیں جو (مردوں کی) تابعدار اور ان کی پیٹھ پیچھے (ان کے مال و متاع کی) حفاظت کرنے والی ہوں۔

چنانچہ اس آیت کریمہ کی شرح و تفسیر حسب ذیل حدیث سے ہوتی ہے۔ "رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہترین عورت وہ ہے کہ جب تو اس کی طرف دیکھے تو وہ تجھے مسرور کردے، جب تو کوئی حکم دے تو وہ بجالائے اور تیری غیر حاضری میں اپنے نفس اور تیرے مال کی حفاظت کرے۔" (مجمع الزوائد جلد چہارم صفحہ 273)

اس اعتبار سے اسلامی شریعت نے عورت پر جو فرائض اور ذمہ داریاں عائد کی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

1- عورت جہاں تک ہوسکے اپنے شوہر کو خوش وخرم رکھنے کی کوشش کرے۔

2- گھریلو معاملات میں شوہر کی اطاعت کرے۔

3- شوہر کی غیر حاضری میں اس کے مال اور اپنے ناموس کی حفاظت کرے اور اس میں کسی قسم کی خیانت نہ کرے۔

اس کے علاوہ متعدد احادیث میں جو مزید احکام مذکور ہیں وہ سب انہیں اصولوں کی شرح وتفصیل ہیں، جن کے ملاحظہ سے اسلام کے معاشرتی نظام کا ایک پورا خاکہ سامنے آجاتا ہے۔

دوزخی عورتیں کون ہیں؟

بہر حال چونکہ عورتوں میں مردوں کی نسبت ناشکری کا مادہ زیادہ ہوتا ہے اس لئے بعض احادیث میں عورتوں کی اکثریت کو دوزخی قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ بعض عورتوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "اے عورتو صدقہ کرو۔ کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ تمہاری اکثریت دوزخی ہوگی۔ اس پر ان عورتوں نے پوچھا کہ یارسول اللہ ایسا کیوں ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ تم اپنے شوہروں پر بہت لعن طعن اور ان کی ناشکری کرتی ہو۔" (بخاری ومسلم)

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اگر تم کسی عورت کے ساتھ عمر بھر احسان کرتے رہو مگر وہ تمہاری کوئی کوتاہی دیکھ لے تو فوراً کہہ اٹھتی ہے کہ میں نے تم سے کبھی کوئی بھلائی سرزد ہو [illegible] رنہیں دیکھی۔" (صحیح بخاری جلد ششم صفحہ 151)

جنتی عورت کی پہچان

ایک حدیث کے مطابق جنتی عورت وہ ہے جس میں حسب ذیل خوبیاں پائی جاتی ہوں۔ "جب کوئی عورت پانچ وقت کی نماز پڑھتی ہے، ایک ماہ کے روزے رکھتی ہے، اپنے ناموس کی حفاظت کرتی ہے اور اپنے شوہر کی اطاعت کرتی ہے تو قیامت کے دن اس سے کہا جائے گا کہ تو جنت کے جس دروازے سے چاہے اس میں داخل ہوجا۔" (کنز العمال، جلد شانزدہم صفحہ 406)

حاصل بحث یہ کہ ہر مسلمان مرد اور عورت کو کوشش یہی کرنی چاہئے کہ وہ اللہ کی عدول حکمی کرکے اپنی عاقبت خراب نہ کرے۔ بلکہ ایک دوسرے کے حقوق پورے خلوص اور مروت کے ساتھ ادا کرکے اپنی دنیا وآخرت دونوں کو سنوارنے کی جدوجہد کرے۔

تعداد ازدواج دنیا کے ہر مذہب میں جائز ہے

تعداد ازدواج (کسی مرد کا ایک سے زیادہ نکاح کرنا) دنیا کے تقریباً تمام مذاہب میں جائز ومشروع رہا ہے اور خاص کر آسمانی مذاہب میں اس کی اجازت پائی گئی ہے اور اس جواز کے متعدد اسباب ووجوہات ہوسکتے ہیں۔ خود یہودی اور ہندو مذاہب میں بھی ان کا رواج رہا ہے حتیٰ کہ مذہبی شخصیتیں اور سابقہ انبیائے کرام (خاص کر انبیائے بنی اسرائیل) بھی تعداد ازدواج POLYGAMY پر عامل تھے۔ لہٰذا اسلامی قانون ہی وہ واحد قانون نہیں ہے جو قابل عتاب ہو یا جس کی طرف انگلی اٹھائی جائے بلکہ موجودہ دور میں بھی 554 معاشروں میں سے 415 میں اس کا رواج موجود ہے اور خاص کر ہندوستان میں مسلمانوں کی بہ نسبت دیگر قوموں میں اس کا رواج زیادہ ہے، جیسا کہ مستند اعداد وشمار سے پتہ چلتا ہے اور پھر 1955ء کے ہندو کوڈ (جس کے ذریعے ہندوؤں کو ایک سے زیادہ شادی کرنا قابل تعزیر جرم قرار دیا گیا ہے) کے بعد بھی ہندوؤں میں تعداد ازدواج کا سلسلہ چور دروازوں سے جاری ہے اور وہ دوسری شادی کرنے کے لئے خاص کر اسلام کے دامن میں پناہ لے رہے ہیں۔ اسی وجہ سے ہندوستانی دانشوران اسلامی قانون پر روک لگانے کی غرض سے

یکساں سول کوڈ کا نعرہ بلند کر رہے ہیں تاکہ وہ اسلامی قانون پر پچھلے دروازے سے وار کر کے اپنے مذہب میں "اصلاح" کر سکیں۔ اس اعتبار سے یہ تحریک خالص سیاسی نوعیت کی ہے۔

تعدد ازدواج پر ایک نظر

یہودی، عیسائی، اسلامی اور ہندو قوانین کا ایک جائزہ، اسلام کی ایک غلط تصویر

ایک امریکی پروفیسر گریگوری کوزلوسکی نے لکھا ہے کہ "میں کبھی کبھی محسوس کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے بارے میں عام امریکی باشندوں کا تصور دو کارٹونوں کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ مسلمان ایک سنگدل اور تشدد پسند ہے، جو ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں قرآن تھامے ہوئے ہے اور دوسرے کارٹون کا تصور انتہائی دوسرے سرے پر ہے، جس میں مسلمان ایک موٹے تازے اور تیل کی دولت سے مالا مال شیخ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، جس کا گھر سونے سے بھرا ہوا ہے اور وہ سو بیویوں والا ہے،

اسلامک ہیرالڈ، کوالالمپور (ملیشیا) جلد 9 شمارہ 5۔

اس طرح آج اسلام کی ساری خوبیاں اور اس کے سارے اقدار (VALUES) پس منظر میں چلے گئے ہیں اور پروپیگنڈے کی قوت اس طرح غالب آ گئی ہے کہ چند بے سروپا قسم کے الزامات یا افواہوں نے حقیقت کی جگہ لے لی ہے۔ اس طرح پروپیگنڈے کے زور پر مسلمانوں کی بھیانک تصویریں کھینچی جاتی ہیں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کو باور کرایا جاتا ہے کہ مسلمان ایک انتہائی متعصب اور جھگڑالو قسم کا آدمی ہوتا ہے جو عموماً کثیر زوجگی کا مرتکب ہو کر (زیادہ تر چار بیویوں والا ہو کر) عورتوں کے حقوق پامال کرتا ہے یہ تو کم پڑھے لکھے طبقے کا حال تھا جو ایک حد تک قابل معافی بھی ہو سکتا ہے کیونکہ اسے اسلامی نظام حیات اور اس کی خوبیوں کے بارے میں کوئی صحیح علم یا جانکاری نہیں ہے۔ لیکن المیہ تو یہ ہے کہ عیسائی دنیا اور مغربی طبقے میں خاص کر تعدد ازدواج یا کثیر زوجگی (POLYGAMY) کے سلسلے میں جو غلط پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے اس کے زیر اثر اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کا ذہن بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ گویا کہ اسلام نے تعدد ازدواج کی اجازت (بعض

ناگزیر معاشرتی و اجتماعی ضرورتوں کے تحت مشروط پر) دے کر نہ صرف یہ کہ عالمی شریعتوں کے مقابلے میں ایک "بدعت" کا ارتکاب کیا ہے بلکہ طبقہ نسواں کی "توہین" کر کے اس کے حقوق بھی پامال کر دیئے ہیں اور پھر لطف یہ کہ اس مسئلے کو کسی مذہب کی حقانیت کے جانچنے کا ایک اعلیٰ معیار قرار دیتے ہوئے کسی مذہب کے بارے میں گفتگو کے لئے اس مسئلے کو سرفہرست رکھا جاتا ہے گویا کہ جس مذہب نے اس کی اجازت دی ہو، خواہ اس کی معقول وجوہات کچھ بھی ہوں، اس میں سرے سے کوئی خوبی ہی نہیں ہو سکتی بلکہ یہ برائی ہزار برائیوں کی ایک برائی بلکہ اتنا سخت اور سنگین جرم متصور ہوگی کہ اس کی بنیاد پر اس مذہب کی تمام خوبیوں پر پانی پھیرا جا سکتا ہے اور جب کبھی ایک تعلیم یافتہ مسلمان کی ملاقات کسی تعلیم یافتہ عیسائی یا مستشرق سے ہوتی ہے تو وہ اپنی گفتگو کا آغاز جان بوجھ کر اسی مسئلے سے کرتا ہے تا کہ وہ اپنی دانست میں اس مسئلے پر گفتگو کر کے ایک مسلمان کو اسلام کی "عدم معقولیت" کا یقین دلا سکے، یا اسلام کے بارے میں اس کے ذہن میں شکوک و شبہات پیدا کر کے اسے برگشتہ کر سکے۔ یہ موجودہ دور میں مستشرقین (علوم مشرقی کے ماہر مغربی علماء) کا ایک خاص حربہ اور ان کی فنکاری ہے۔

تعدد ازدواج پر ایک مباحثہ

شام کے مشہور ماہر قانون ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے اس سلسلے میں اپنا ایک واقعہ تحریر کیا ہے کہ 1956ء میں جب وہ دمشق یونیورسٹی کے ایک وفد کے ساتھ ایک تعلیمی و تحقیقی سفر کے تحت لندن گئے تو وہاں پر ان کی ملاقات پروفیسر انڈرسن سے ہوئی جو لندن یونیورسٹی کے شعبہ مشرقی میں مشرقی عائلی قوانین (پرسنل لاء) کے صدر تھے اور ان دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ تعدد ازدواج (POLYGAMY) کے سلسلے میں اس طرح تھی۔

انڈرسن: تعدد ازدواج کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

مصطفیٰ سباعی: ایک صالح نظام ہے جو معاشروں کے لئے اکثر حالات میں مفید اور فائدہ بخش ہے، جب کہ اس کا نفاذ چند شرائط کے ساتھ ہو۔

انڈرسن: تب تو آپ کی رائے محمد عبدہ (مصر کے ایک مشہور عالم) کی رائے کے

مطابق ہے، جن کا نظریہ اس سلسلے میں چند شرائط کو واجب قرار دینے کا تھا۔

مصطفیٰ سباعی: قریب قریب، لیکن پوری طرح نہیں بلکہ میرا نظریہ دوسری بیوی کے نفقہ کی استطاعت رکھنے کے لحاظ سے مرد پر شرط عائد کرنے کا ہے تاکہ اسلام کے مطالبے کے مطابق بیویوں کے درمیان عدل کا اثبات ہو سکے۔

انڈرسن: کیا آپ جیسا آدمی بھی موجودہ دور میں تعدد ازدواج کا حامی ہوسکتا ہے؟

مصطفیٰ سباعی: میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں آپ مجھے صراحت کے ساتھ اس کا جواب دیجئے۔ اگر کسی کی بیوی ایک متعدی مرض یا کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہو جس کی شفایابی کی کوئی امید ہی نہ رہ گئی ہو اور وہ نوجوان بھی ہو تو اس وقت وہ کیا کرے؟ اس صورت میں اس کے سامنے تین ہی راستے ہوں گے۔ ایک یہ کہ اسے طلاق دے دے۔ دوسرا یہ کہ وہ نکاح ثانی کرے اور تیسرا یہ کہ وہ اپنی بیوی سے خیانت کرتے ہوئے غیر قانونی طور پر کسی دوسری عورت سے رابطہ رکھے۔ (لہٰذا اب اسے کیا کرنا چاہئے؟)

انڈرسن: اس صورت میں ایک چوتھا راستہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ صبر کرے اور اپنے نفس کو حرام سے بچائے رکھے۔

مصطفیٰ سباعی: تو کیا ہر شخص اپنے آپ کو حرام سے بچائے رکھنے کی قدرت رکھتا ہے؟

انڈرسن: ہم مسیحی اس بات کی قدرت رکھتے ہیں کیونکہ ہمارے نفوس میں ایمان کی تاثیر موجود ہے۔

مصطفیٰ سباعی: (مسکراتے ہوئے) کیا آپ ایک مغربی ملک کے باشندے ہوتے ہوئے بھی یہ بات کہہ رہے ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ بات کوئی مسلمان یا مشرقی ملک میں رہنے والا کوئی عیسائی کہتا تو وہ زیادہ قابل فہم ہوسکتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو حرام سے بچائے رکھنے کی استطاعت رکھ سکتا ہے کیونکہ اس کا ماحول ابھی تک عورت کے ساتھ ہر وقت اور ہر آن مل جل کر رہنے کا بنا ہوا نہیں ہے کیونکہ اس کی روایات اور اس کے اخلاق اب تک اس کے تصرفات پر غالب ہیں اور اس کے دین کا اثر اب بھی اس کے ملک میں برابر موجود ہے جبکہ دوسری طرف تم مغربیوں کا حال یہ ہے کہ تم نے عورت کے ساتھ مل جل کر رہنے کا کوئی سا طریقہ بھی نظر انداز نہیں کیا ہے اور اسے بہکانے کا کوئی سا حیلہ بھی باقی نہیں رکھ

چھوڑا ہے۔ یہاں تک کہ تم لوگ اب دن رات کا کوئی بھی لمحہ عورت کے بغیر گزارنے کی پوزیشن ہی میں نہیں رہ گئے اور تم ہی وہ لوگ ہو جن کا معاشرہ مے خانوں اور رقص گاہوں کی محفلوں کے شور وغل سے گونج رہا ہے اور تمہاری سڑکیں حرامی بچوں سے بھری ہوئی ہیں۔ تو ایسی صورت میں کیا تم دعویٰ کر سکتے ہو کہ تمہارا دین تمہاری بیمار بیوی کی خیانت سے روکتا ہے؟ اور یہ بات کیوں کر ممکن ہو سکتی ہے جب کہ (مریضوں بیویوں کی بات تو ایک طرف رہی) خود بھلی چنگی، خوب صورت اور نوجوان بیویوں کی خیانت اور بددیانتی کی خبروں سے اخبارات و رسائل کے کالم سیاہ رہتے ہیں اور ان واقعات سے عدالتیں بھری ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

انڈرسن: میں تو صرف اپنی بات کہہ رہا ہوں۔ ہاں تو میں اپنے نفس پر قابو پانے اور صبر کرنے پر قادر ہوں۔

مصطفیٰ سباعی: بہت خوب! تو اس صورت میں آپ جیسے مسیحی اور مغربی لوگوں کا تناسب...... جو اپنے نفس پر قابو رکھ سکتے ہیں...... ان لوگوں کے مقابلے میں جو اپنے نفس پر قابو نہیں رکھ سکتے کیا ہے؟

انڈرسن: مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔ (انهم قليلون جداً)

مصطفیٰ سباعی: تو کیا آپ کی نظر میں قانون ان لوگوں کی خاطر بنایا جا سکتا ہے جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہو؟ یا عوام اور زیادہ لوگوں کے لئے؟ اور ایسے قانون کا کیا فائدہ جس کا اطلاق ایک محدود طبقے ہی پر ہو سکے؟

اس پر انڈرسن خاموش ہو گیا اور کوئی جواب نہ دے سکا۔

المرأة بين الفقه والقانون، از ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی صفحہ 87 سے 88 مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت چھٹا ایڈیشن 1404ھ

مسیحیت کا غیر معقول رویہ

اس مختصر سے مباحثے کے ذریعے بڑی خوبی کے ساتھ جہاں ایک طرف اسلام کے

جائز کردہ تعدد ازدواج کی ضرورت واہمیت پر روشنی پڑتی ہے تو دوسری طرف مسیحیت اور مسیحی دنیا کے ایک غیر فطری اور متضاد طرزِ عمل کی تصویر بھی سامنے آتی ہے۔ مگر مغربی طرزِ فکر رکھنے والے لوگ بجائے اس کے کہ اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے اپنے قانون میں موجود شدہ نقائص کو دور کرنے کی کوشش کرتے، الٹے ایک معقول اور متوازن قانون کو غیر فطری اور غیر معقول قرار دینے کے درپے نظر آتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ نکاح، طلاق اور تعدد ازدواج یعنی کثیر زوجگی کے سلسلے میں مسیحی قانون کی بنیاد موجودہ اناجیل (GOSPELS) کے چند ناقص تصورات پر مبنی ہے (جس کی تفصیل آگے رہی ہے) جن کو اصل قرار دے کر مسیحی دنیا نے تعدد ازدواج کو ناجائز قرار دے دیا (مگر اس میں بھی کلیسا کا رویہ اور کردار مشکوک اور متضاد ہے)...... حالانکہ یہ بات شریعت موسوی یا عہد نامہ قدیم (Old Testament) کے بالکل خلاف ہے۔ کلیسا (چرچ) کے اس غیر معقول رویہ کے باعث موجودہ عیسائی اور مغربی دنیا فکر و عمل کے ایک ایسے عجیب و غریب تضاد میں مبتلا ہو گئی ہے جس کی مثال دین و شریعت کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مگر اپنی کمزوریوں کو دور کر کے صحیح طرزِ فکر اور معقول رویہ اپنانے کے بجائے الٹے اسلامی شریعت جیسے کامل اور دوامی قانون پر طرح طرح کے بے سروپا اعتراضات اس سلسلے کی ایک اور فاش غلطی ہے جو الٹے چور کوتوال کو ڈانٹے کا مصداق ہے۔

لہٰذا اس مضمون میں اس قسم کے مغالطوں اور فریب کاریوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے اس سلسلے میں حقیقت حال کا تعارف کرانا اور اسلام اور مسیحیت کا ایک صحیح موازنہ (تعدد ازدواج کی روشنی میں) پیش کرنا مقصود ہے تا کہ اسلامی شریعت کی برتری اور اس کی خوبیوں کا حال علمی و سائنٹفک نقطہ نظر سے پوری طرح سامنے آجائے اور اس کے ساتھ ہی اصل ہندو قانون کا تعارف کراتے ہوئے ہندوستان کی جدید قانون سازی کی بعض خامیوں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔

موجودہ ہولناک صورت حال

واقعہ یہ ہے کہ معاشرتی اور تمدنی اعتبار سے ایک مرد کے لئے کبھی کبھی ایک سے زیادہ

بیویاں کرنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ ان مخصوص اسباب وحالات میں اگر اسے اس کی اجازت نہ ملے تو پھر اس کی فطرت بغاوت پر آمادہ ہوجاتی ہے اور خلاف قانون طریقے اختیار کرنے لگتی ہے جیسا کہ موجودہ مغربی معاشرے میں اس کا اظہار بالکل نمایاں نظر آرہا ہے۔ چنانچہ آج جنسی انحرافات (Sexual Deviations) کے ایسے عجیب و غریب طریقے منظر عام پر آرہے ہیں جن پر دانشوروں اور انسانیت کا درد رکھنے والوں کو سخت تشویش لاحق ہوگئی ہے اور اس سلسلے کے اعداد و شمار ہولناک حد تک زیادہ اور تشویشناک ہیں۔ مگر مسیحی دنیا اور خاص کر اس کا مذہبی اختیار رکھنے والا ادارہ یعنی کلیسا (چرچ) اس سلسلے میں نہ صرف بے حس ہے بلکہ ایک خاموش تماشائی کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہے اور اس خطرناک بے راہ روی کا صحیح علاج کرنے کے بجائے اپنے غیر معقول طرزِ عمل اور ضد پر اڑا ہوا ہے اور مسیحی دنیا کی اس بے جا ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے نوع انسانی نہ صرف جنسی بے راہ رویوں میں مبتلا ہو کر اپنی تباہی کا سامان خود اپنے ہاتھوں سے کر رہی ہے بلکہ ایک صحیح اور معقول علاج پر محض اندھے تعصب کی بنا پر روک لگاتے ہوئے ایک صحیح چیز کو غلط اور ایک غلط چیز کو صحیح قرار دینے کے درپے بھی نظر آتی ہے۔

مگر بعد از خرابی بسیار اب کچھ عرصہ سے خود مغربی مفکرین اور دانشوروں کے ایک معتد بہ طبقے کو اس سلسلے میں خرابیوں کا احساس ہو رہا ہے اور وہ مسیحیت اور کلیسا کے غلط رجحان کو ہدف تنقید بنا رہے ہیں اور اس کی کوتاہیوں کا اظہار برملا کر رہے ہیں۔ اس طرح مختلف حلقوں سے اصلاح کی آوازیں اٹھنے لگی ہیں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا اب آہستہ آہستہ دین فطرت کی طرف بڑھ رہی ہے اور اسلامی شریعت کی ضرورت واہمیت نہایت درجہ شدت کے ساتھ محسوس کی جانے لگی ہے۔ اس سے اسلامی قانون کی برتری اور اس کی ابدیت وعالمگیری کے ناقابل تردید دلائل ہمارے سامنے آتے ہیں۔ لہٰذا اس سلسلے میں مختلف مذاہب اور قوانین کا ایک جائزہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ خصوصیت کے ساتھ عیسائیت کی کوتاہیوں کو منظر عام پر لانا بھی ضروری ہے، جن کی بنا پر عالم انسانی انحراف اور جنسی بے راہ روی کے راستے پر چل پڑا اور عصر جدید میں فسق و فجور کا جو سیلاب آیا ہوا ہے وہ اسی جنسی بے راہ روی کا نتیجہ ہے جو مسیحیت اور کلیسا کا پیدا کردہ ہے۔

انبیائے سابقین اور کثرت ازدواج

آج کثیر زوجگی (POLYGAMY) پر سب سے زیادہ اعتراض عیسائیوں اور ان کے توسط سے مغرب پرستوں اور جدید تعلیم یافتہ ہندوؤں کو ہے۔ مگر دینی و شرعی اعتبار سے عیسائیوں اور ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں کثیر زوجگی کا جواز اور ثبوت ملتا ہے۔ مگر عیسائی لوگ اس سلسلے میں اسلام پر اس طرح اعتراض کرتے ہیں گویا کہ اس نے کثیر زوجگی کو جائز قرار دے کر کسی بہت بڑی بدعت یا جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ مگر وہ اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں بلکہ اس سے بھی پہلے اس کا عام رواج تھا اور یہودی شریعت عیسائی قانون کی اصل بنیاد ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام و مرتبہ یہودیت، عیسائیت اور اسلام تینوں مذاہب میں مسلم ہے اور یہ تینوں آپ کو اپنا روحانی پیشوا اور ابوالانبیاء مانتے ہیں کیونکہ ان تینوں کا سلسلہ آپ ہی پر ختم ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ کی دو بیگمات تھیں۔ حضرت سارہ اور حضرت ہاجرہ، پہلی بیوی کے بطن سے حضرت اسحاق پیدا ہوئے جن سے بنی اسرائیل کی نسل چلی اور دوسری بیوی سے حضرت اسماعیلؑ کی ولادت ہوئی جو عربوں کے جد امجد کہلائے۔ (بائبل کی کتاب پیدائش، باب 29 اور 30)

اسی طرح حضرت یعقوبؑ کی دو بیویاں اور دو حرمیں تھیں۔ حضرت اسحاق کے بڑے لڑکے عیسو کی کئی بیویاں تھیں۔ (کتاب پیدائش: باب 28، صفحہ 9)

حضرت داؤد کی متعدد بیگمات تھیں اور مشہور یہ ہے کہ ان کی تعداد ایک سو تھی۔ (2 سموئیل، باب 5 صفحہ 3)

حضرت سلیمان کی سات سو بیگمات اور تین سو حرمیں تھیں۔ (1 سلاطین 11 باب صفحہ 3) اور آپ کے بڑے بیٹے رحعام کی 18 بیویاں اور 60 حرمیں تھیں۔ (2 تواریخ باب 11 صفحہ 21)

مسیحیت میں ازدواجی زندگی بجائے خود ناپسند

بائبل کے عہد نامہ قدیم (OLD TESTAMENT) میں اس طرح کی اور بھی

مثالیں مل سکتی ہیں۔ بقول نیوفیلڈ (NEUFELD) تورات اور تلمود کی رو سے کثیر زوجگی کی مطلق اجازت ہے۔ المراۃ فی السلام، از عباس، محمود عقاد، صفحہ 73، مطبوعہ بیروت 1981ء۔

اس طرح تورات اور ما قبل تورات شرائع کے مطابق کثیر زوجگی جب مطلق طور پر ثابت ہے تو پھر اسلام پر اعتراض کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ اب رہا مسیحیت (CHRISTIANITY) کا معاملہ تو اس میں کثرت ازدواج تو بہت دور کی چیز ہے، خود ایک زوجگی (MONOGAMY) بھی ناپسندیدہ چیز ہے، جو سخت مجبوری اور گناہ سے بچنے ہی کے لئے جائز قرار دی گئی ہے۔ جیسا کہ سینٹ پال (جو خود بھی ایک غیر شادی شدہ تھا) کی اس تاکید سے ظاہر ہوتا ہے۔

St. Paul, himself a bachelor, recommended marriage only as prevention of sin.

Melvin L Defluer, Sociology: Human Society, Second Edition, P.445, Illinois (USA) 1976.

ازدواجی زندگی روحانیت کی نفی

بلکہ سینٹ آگسٹائن کی پانچویں صدی کی تحریروں میں تو ''روح اور گوشت'' کے درمیان جنگ کا اظہار نہایت درجہ شدت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کے نزدیک جنسی عمل (SEX) بنیادی طور پر گناہ آلود ہے، جو صرف تولیدی عمل کی غرض سے قابل معافی ہو سکتا ہے، اس کا یقین تھا کہ جنسی عمل ایک حیوانی شہوت ہونے کے لحاظ سے روحانیت کی نفی کرتا ہے، اس لئے اس قسم کے معیاروں کو ترقی پانے اور ان کی انجام دہی سے جوڑوں (عورتوں اور مردوں) کی ہمت شکنی کرنی ہے۔ چنانچہ سینٹ آگسٹائن کی ازدواجی زندگی کی مذمت کا یہ نظریہ عیسائی دنیا پر ایک ہزار سال تک چھایا رہا۔

"The conflict between spitit and flesh was most powerfully expressed in the writtings of St.

Augustine in the fifth century. He saw sex as basically sinful, excusable only for purposes of procreation, He believed that the sex act, as an act of animal lust, was despiritualizing and that norms had to be developed to discourage couples from performing it. Augustine's theology of marriage and family life dominated Church thinking for over a thousand years ibid.

کیا عورت بدی کی جڑ ہے؟

اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ مسیحی عقیدے کے مطابق حضرت آدم وحوا علیہما السلام کی وہ خطا جس کے باعث انہیں جنت سے نکالا گیا، اس کا باعث حوا تھیں۔ لہٰذا اس گناہ کے باعث ہر عورت کا کردار بنیادی طور پر داغدار ہے۔

.....because women carry "the stain of Eve"

Encyclopaedia Britannica, Vol.4, P.523, 1983.

اس طرح دنیا کی ہر عورت اپنی اصل فطرت کے اعتبار سے گنہگار اور بدی کی جڑ تصور کی گئی اور اس سے دور رہنے کی تعلیم کے نتیجے میں مکمل تجرد، درویشی اور رہبانیت کی ہمت افزائی کی گئی، جس نے ایک فلسفے اور تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ عورت کو کمتر سمجھنے اور اس سے چھوت چھات برتنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسیحیت میں مرد اور عورت کے درمیان صحیح روابط اور صحیح حدود قائم کرنے کا تصور ہی نہیں رہا۔ بلکہ یہ سب چیزیں غیر ضروری اور روحانیت کے منافی تصور کر کے نظر انداز کر دی گئیں۔ اس کا راست نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں جنسوں کی حقیقت ہی پوری طرح مشتبہ ہو گئی۔ جب کہ واقعہ کے اعتبار سے مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہیں۔ لہٰذا روحانیت یہ نہیں ہے کہ ایک آدمی عورت سے پرہیز کرتے ہوئے کسی جنگل یا بیابان میں جا کر بیٹھ جائے۔ اس طرز عمل سے تمدن انسانی کی گاڑی ٹھپ

ہو کر رہ جاتی ہے۔

اسلام کی نظر میں عورت کی تخلیق کا بنیادی مقصد جو بتایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ عورت اُنس ومحبت اور غمخواری کے لئے پیدا کی گئی ہے جس کی وجہ سے طبیعت میں فرحت ونشاط کے ساتھ ساتھ روحانی اقدار کو بلند کرنے میں بھی مدد ملتی ہے اور اس کی وجہ سے مادیت و روحانیت کے درمیان ایک توازن قائم رہتا ہے اسی بنا پر صنف نازک کو حسن اور خوبصورتی عطا کی گئی ہے تا کہ مرد اس کی طرف مائل ہو (دیکھئے قرآن مجید میں اس حقیقت پر کتنے انوکھے اور حقیقت افروز انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

وَ مِنْ اٰیٰتِہٖ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْا اِلَیْھَا وَ جَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّ رَحْمَۃً (سورۃ روم 30، آیت 21) اور اللہ کی نشانیوں میں سے ہے یہ بات کہ اس نے تمہارے لئے تم ہی میں سے بیویاں بنائیں تا کہ تم ان سے سکون حاصل کر سکو اور اس نے تمہارے درمیان آپسی محبت اور مہربانی بھی رکھ دی (تا کہ تم اپنی زندگی خوش گوار بنا سکو)

یہ آیت کریمہ ضمناً ان تمام غلط تصورات کی بھی تردید کرتی ہے جو عورت کے بارے میں کلیسا اور مسیحی دنیا میں مروج رہے ہیں اور ثابت کر رہی ہے کہ انسان ہونے کی حیثیت سے عورت کا مقام مرد ہی کے برابر ہے جیسا کہ اس موقع پر ''من انفسکم'' کے الفاظ وضاحت کر رہے ہیں۔

یعنی جس طرح مرد نوع انسانی کے افراد ہیں اسی طرح عورتیں بھی نوع انسانی ہی کی افراد ہیں ار جس طرح مردوں میں روح انسانی کار فرما ہے اسی طرح عورتوں میں بھی یہی روح کام کر رہی ہے جس کا مسیحی دنیا کو انکار رہا ہے۔

عیسائی نظام میں دو متضاد رجحانات

اصل بات یہ ہے کہ مسیحیت میں ایسی کوئی جامع شخصیت نہیں گزری جو عوام کے لئے دینی و دنیوی دونوں اعتبار سے ایک مثالی نمونہ یا ماڈل بن سکتی ہو بلکہ اس میں زیادہ تر دنیا داری کو خیر باد کہتے ہوئے زہد و رہبانیت کی زندگی اختیار کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ حضرت

عیسیٰ علیہ السلام ایک غیر شادی شدہ شخص تھے اور سینٹ پال وغیرہ بھی غیر شادی شدہ تھے۔ لہٰذا ان دونوں کو اس باب میں ایک نمونہ مانا گیا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس قسم کی زاہدانہ زندگی انسانی فطرت سے میل نہیں کھاتی۔ اسی وجہ سے خود عیسائی دنیا اس طرز فکر پر کبھی کاربند نہ رہ سکی بلکہ اس میں دنیاداری یا ازدواجی زندگی کا رجحان بھی برابر موجود رہا ہے۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی تصریح کے مطابق عیسائیت کے عائلی نظام (ازدواج، خاندان اور جنس) میں یہ دو مختلف اور متضاد بنیادی رجحانات ہمیشہ ہی باہم دست بگریباں نظر آتے ہیں۔

Two basic tendencies, which are in constant tension with one another, can be observed in the Christian under standing of marriage, family, and sex: (1) the tendency to spiritualize and individualize the marriage relationship between man and wife in the light of the Gospel and to realize the basic demands of Christian ethics in marriage and family; and (2) and a sectic tendency that interprest marriage and family as ordersof the old world, which have hasically been overcome already and have no room in the new eon.

Encyclopaedia Britannica, Vol.4, P.522 1983

ترجمہ: دو بنیادی رجحانات، جو ایک دوسرے سے مسلسل متصادم ہیں، شادی، خاندان اور جنس کے مسیحی طرز فکر میں دیکھا جاسکتا ہے: (1) وہ رجحان جو مرد اور عورت کے درمیان ازدواجی تعلق کو انجیل کی روشنی میں انفرادی اور روحانی بنا سکے اور جو کہ شادی اور خاندان سے متعلق مسیحی اخلاقیات کے بنیادی تقاضوں کو پورا کر سکے (2) وہ راہبانہ رجحان جو شادی اور خاندان کو پرانی دنیا کے ان اقدار سے تعبیر کرتا ہے جو مغلوب کئے جاچکے ہیں اور اب نئے

جگ میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں رہ گئی ہے۔

اس اعتبار سے ایک خوب صورت قسم کا راہبانہ فلسفہ جس میں نہ صرف تعدد ازدواج بلکہ بجائے خود ازدواجی زندگی کی مذمت کی گئی ہو، فکری اعتبار سے تو بڑا "خوش کن" نظر آسکتا ہے مگر واقعات اور عمل کی دنیا میں وہ ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔ اس اعتبار سے مسیحیت انسانی زندگی کے لئے کوئی آئیڈیل فلسفہ اور اس کی فطرت سے مطابقت رکھنے والا کوئی موزوں ضابطہ حیات نہیں ہوسکتا۔ بالفاظ دیگر مسیحیت سارے جہاں کے لئے کسی متوازن شریعت کی حامل دکھائی نہیں دیتی۔

حاصل یہ کہ مسیحی طرز فکر انسانی فطرت اور اس کی نفسیات کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا انسانی فطرت سے اعراض کا وہی نتیجہ نکلنا چاہئے تھا جو آج ہمارے سامنے مختلف قسم کے جنسی انحرافات (Sexual Deviations) کی شکل میں ظاہر ہورہا ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ مسیحی دنیا اپنے اس نقص اور کوتاہی کا علاج کرنے اور اپنی غلطیوں کو درست کرنے کے بجائے دوسرے مذاہب کے متوازن اور منصفانہ قوانین پر اعتراض کرتے ہوئے یہ چاہتی ہے کہ وہ خود جس طرح بگڑی ہوئی ہے اسی طرح دوسرے صحیح مذاہب بھی بگڑ جائیں۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ تورات عیسائیوں کے لئے بھی شریعت کا درجہ رکھتی ہے...... جس میں تعدد ازدواج مطلق طور پر جائز ہے۔ لہٰذا عیسائیوں کے لئے یہودی شریعت کا اتباع شرعاً واجب ہے (جیسا کہ اس کا اعتراف خود ان کو بھی ہے) مگر انہوں نے اس معاملے میں تورات کی شریعت اور اگلے پیغمبروں کی سنت کو نظر انداز کردیا ہے۔ اسلامی شریعت بھی یہودی شریعت ہی کی طرح تعدد ازدواج کو جائز قرار دیتی ہے۔ لہٰذا یہ قانون مؤکد طور پر قابل حجت بن جاتا ہے۔ لہٰذا اس باب میں عیسائیوں کو انکار کی گنجائش باقی نہیں ہے اور اس اعتبار سے اسلامی شریعت کوئی نئی شریعت نہیں ہے، جس نے تعدد ازدواج کی اجازت دنیا میں پہلی بار دی ہو۔ لہٰذا تعدد ازدواج کی "شہوت پرستی" کا مظہر قرار دینے کا یہ مطلب ہوگا کہ خود ان کے اپنے پیغمبر بھی (جن کو وہ آئیڈیل کردار والے اور جلیل القدر سردار مانتے ہیں) شہوت پرست تھے اور جیسا کہ اگلی بحث سے ظاہر ہوگا خود ہندومت کے اصل قانون کی رو سے بھی تعدد ازدواج جائز تھا اور ہندو مذہب میں آج بھی اس کا رواج مسلمانوں

غرض ڈاکٹر الٹیکر نے سنسکرت کے متعدد حوالوں کے ساتھ لکھا ہے کہ مؤخر ویدک لٹریچر میں متعدد شہادتیں ملتی ہیں کہ کثیر زوجگی کا رواج معاشرے کے کچھ طبقات میں پوری طرح سرایت کئے ہوئے تھا۔ نیز موصوف کی تصریح کے مطابق بہت سے ابتدائی معاشروں میں بیویاں خود اپنے شوہروں سے تقاضا کرتی تھیں کہ وہ مزید شادیاں کر کے ان کی تعداد بڑھائے، تا کہ ان کے گھریلو کام اور مشقت میں تخفیف ہو جبکہ شادی کا سب سے بڑا مقصد عورت کے لئے اپنے شوہر کا کام کرنا ہوتا تھا۔ لہٰذا وہ چاہتی تھی کہ اس کام میں دوسری عورتیں بھی اس کی شریک ہو جائیں۔ Hindu Civilazation page 105

یہی مصنف ""کاما سوترا"" کے حوالے سے مزید لکھتا ہے کہ ہندو مذہب میں شادی کے ذریعے نرینہ اولاد (لڑکے) کا حصول غیر مشروط طور پر ضروری سمجھا جاتا تھا۔ ورنہ پہلی بیوی بانجھ ہونے کی صورت میں اسے دوسری شادی کی اجازت حاصل تھی بلکہ بعض تحریروں کے مطابق ایک بیوی کا یہ فرض تھا کہ وہ بانجھ ہونے کی صورت میں خود ہی اپنے شوہر کو دوسری شادی کے لئے مجبور کرے۔

.....a son was absolutely necessary, and so society permitted the husband to take a second wife, if the first one was barred, Nay we find some writers laying down that it was the duty of the wife to urge her husdband to contract a second marriage, if she had failed to present a son to him. Hindu Civilazation page 105 to 106

مشہور محقق و سائنسدان ابوریحان البیرونی (متوفی 1048ء) جس نے سالہا سال تک ہندوستان میں مقیم ہو کر سنسکرت زبان سیکھی، پھر یہاں کے علوم و فنون اور رسم و رواج کا گہرائی کے ساتھ مشاہدہ کر کے ایک مستند ترین کتاب عربی زبان میں لکھی، جو کتاب الہند کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا اصل نام ""کتاب البیرونی فی تحقیق ماللھند"" ہے۔ اس میں موصوف نے تعدد ازدواج کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اصولی طور پر اسلامی قانون کے

عین مطابق معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ: (یہاں پر) مرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ایک سے زیادہ شادیاں چار تک کرے اور چار سے زیادہ کرنا اس کے لئے حرام ہے۔ ہاں اگر ان میں سے کوئی ایک مر جائے تو اس صورت میں وہ چار کا عدد پورا کر سکتا ہے۔ اب رہا عورت کا معاملہ تو شوہر کے مر جانے کی صورت میں اس کے لئے نکاح ثانی کی اجازت نہیں ہے بلکہ اس صورت میں اس کے سامنے دو ہی راستے ہوں گے: یا تو وہ زندگی بھر بیوگی کی حالت میں رہے یا اپنے آپ کو جلا لے (ستی ہو جائے) اور یہ دوسری صورت اس کے لئے بہتر ہے کیونکہ وہ باقی عمر عذاب کی حالت میں رہے گی۔"

وہ مزید تحریر کرتا ہے کہ "اہل ہند میں سے بعض کی نظر میں طبقاتی اعتبار سے متعدد عورتیں ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ برہمن کے لئے چار، چھتری (کشتر) کے لئے تین، ویش کے لئے دو اور شودر کے لئے ایک بیوی ہوگی اور ان چار طبقوں میں سے ہر ایک طبقے کے لئے جائز ہے کہ وہ شادی یا تو اپنے طبقے میں کرے یا اپنے سے نچلے طبقے میں۔ مگر اس کے لئے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے سے اوپر کے طبقے میں شادی کرے۔ نیز ایک طبقے کی دوسرے طبقے سے شادی کی صورت میں بچہ کی طرف منسوب ہوگا۔ مثلاً اگر کوئی برہمن مرد برہمن عورت سے شادی کرے تو اس کا بچہ بھی برہمن ہوگا لیکن اگر کوئی برہمن شودر عورت سے نکاح کرے تو اس صورت میں بچہ شودر ہوگا (کتاب الہند، البیرونی صفحہ 469 سے 470)

اس اعتبار سے یہ ایک دلچسپ قانون ہے جو طبقاتی فرق و امتیاز کی وجہ سے انسانی مساوات کے خلاف ہے۔

ڈاکٹر لیبان تحریر کرتا ہے کہ ہندو مذہب میں تعدد ازدواج جائز تھا (اور یہ) رسم زیادہ تر خوشحال لوگوں میں ہے اور نیچے کے طبقات میں عموماً ایک ہی بیوی ہوتی ہے۔

(تمدن ہند، مترجمہ سید علی بلگرامی، صفحہ 471)

ان تصریحات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم ہندو شریعت میں تعدد ازدواج پر کوئی پابندی نہیں تھی بلکہ معیار زیادہ تر چار بیویوں کا تھا، جو اسلامی شریعت سے بھی مطابقت رکھتا ہے اور بعض قوانین میں غیر معین حد کا جواز یہودی شریعت سے مشابہت رکھتا ہے۔ مگر اس

باب میں اسلامی شریعت کی خصوصیت اور اس کا اصلاحی اقدام یہ ہے کہ وہ اس تعداد کو سختی کے ساتھ چار تک محدود کرتی ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں میں چندزوجگی کا تناسب

یہ تھا قدیم ہندو مذہب و معاشرے کا ایک مختصر حال۔ اب جدید معاشرے کی طرف آیئے تو اس میں آج بھی ہمیں تعدد ازدواج کا رواج مسلمانوں کی بہ نسبت زیادہ نظر آتا ہے۔ چنانچہ 1981ء کے ایک سروے کے مطابق مسلمانوں میں بیک وقت دو شادیوں (Bigamy) کا رواج 4.3 فیصد ہے جبکہ ہندوؤں میں 5.6 ہے۔ بدھ مذہب والوں میں 8 فیصد ہے اور قبائلی علاقوں میں سب سے زیادہ یعنی 15 فیصد ہے۔ (روزنامہ دکن ہیرالڈ بنگلور، مورخہ 24 اپریل 1984ء)

رجسٹرار جنرل آف انڈیا کی رپورٹ 1961ء کے مطابق جینیوں میں یہ تناسب 9 فیصد ہے۔

تامل ناڈو کے ایک سروے کے مطابق تقریباً یہی اعداد و شمار ظاہر ہوتے ہیں کہ مسلمانوں میں یہ تناسب چار فیصد اور ہندوؤں میں ساڑھے پانچ فیصد ہے۔

روزنامہ اسٹیٹس مین کلکتہ، 28 ستمبر 1984ء، بحوالہ نئی دنیا 11 فروری 1986ء

نیز حکومت ہند کی منسٹری آف ایجوکیشن اینڈ سوشل ویلفیئر کی ماتحت کمیٹی کی وہ رپورٹ جو اس نے 1974ء میں ہندوستان میں عورتوں کی حالت سے متعلق پیش کی تھی، اس کی رو سے ہندوستان میں دوزوجگی کا تناسب مختلف اوقات میں اس طرح تھا۔

	1930ء	1940ء	1941ء	1950ء	1951ء	1960ء
			فیصد	فیصد		فیصد
قبائلی			9.53	17.53		17.98
ہندو			6.79	7.15		5.06
مسلمان			7.29	7.06		4.31

ہفت روزہ ریڈینس دہلی، مورخہ 1985/11/24ء

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں دوزوجگی کا رجحان برابر گھٹ رہا ہے، جو 1940ء کے دہے میں موجود سات فیصد سے گھٹ کر 1960ء کے دہے میں چار فیصد ہوگیا ہے۔ اس طرح کی متعدد رپورٹوں سے مسلمانوں کے خلاف کئے جانے والے غلط پروپیگنڈے کا پول پوری طرح کھل جاتا ہے کہ حقیقت اور افواہوں میں کتنا بڑا فرق ہے!

تعدد ازدواج مسلم ممالک میں

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مطابق ایک مشہور ماہر انسانیات (ANTHROPOLOGIST) جارج مرڈاک کی درجہ بندی کی رو سے 250 کلچروں یا معاشروں میں سے 193 چندزوجگی یعنی ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا رواج پایا گیا ہے۔

(انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ہفتم صفحہ 155 ایڈیشن 1983ء)

نیز ایک دوسرے حوالے میں مذکورہ بالا ماہر (MURDOCK) ہی کی ایک اور رپورٹ 1949ء کے مطابق دنیا کی 554 قوموں میں سے 415 میں کثیرزوجگی کا رواج پایا جاتا ہے۔

In his comparision of types of marriage in a world wide sample of 554 societies, Murdock (1949) found polygamy in 415 and polyandry in noly 4. Dyer, Everett D. Courtship, Marriage, and Family, P.20, Home wood, Illinois (USA) 1983.

اس موقع پر قدرتی طور پر ذہن میں یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ ہو نہ ہو مسلم ملکوں میں چندزوجگی کا رواج زیادہ پایا جاتا ہوگا۔ جی نہیں، بلکہ حیرت انگیز طور پر مسلم ملکوں میں چندزوجگی کی بہ نسبت یک زوجگی کا رجحان ہی زیادہ غالب نظر آتا ہے۔ چنانچہ برٹانیکا کے مذکورہ بالا بیان کے معاً بعد حسب ذیل صراحت موجود ہے۔

It is doubtful, however, whether such Islamic

countries as Algeria, Tunisia, Egypt and Pakistan should today be classified as polygynous public opinion there seems now to favour monogamy.

Encyclopaedia Britannica, Vol.7 P.155, 1983

نیز اسی انسائیکلوپیڈیا کے مضمون نگاروں کو اس سلسلے میں مزید اعتراف ہے کہ اسلامی شریعت میں تعدد ازدواج یعنی ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت کے باوجود اسلامی معاشرے میں زیادہ تر یک زوجگی ہی کا رواج رہا ہے۔

.....the normal practice in Islamic society has always been that of monogamy.

Ibid, Vol.9 P.920

اور ڈاکٹر مصطفیٰ سباعیؒ نے تحریر کیا ہے کہ عرب ممالک کے اعداد و شمار کے مطابق ظاہر ہوتا ہے کہ ایک سے زیادہ شادی کرنے والوں کا تناسب بہت ہی کم ہے جو فی ہزار ایک بھی نہیں ہے۔ (فالاحصاء ات التی تنشر عن الزواج و الطلاق فی البلاد العربیۃ الاسلامیۃ تدل علی ان نسبۃ المتزوجین باکثر من واحدۃ نسبۃ ضیلۃ جدا لاتکاد تبلغ الواحد بالالف)

(المراۃ بین الفقہ والقانون، ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی صفحہ 111، بیروت 1984ء)

یہ ہے مسلمانوں کی ''شہوت پرستی'' اور ان کے چار چار شادیاں کرنے کا افسانہ، جس کے باعث عوام کے سامنے ان کی ایک ایسی مہیب اور خیالی تصویر پیش کی جاتی ہے جس کا واقعات کی دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے۔ معترضین اپنی خیالی تصویروں کے ذریعے دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ مسلمان گویا کہ اس دنیا کی مخلوق نہیں بلکہ کسی اور دنیا کی مخلوق ہیں۔

جدید ہندو قانون کے نقائص

جیسا کہ عرض کیا جا چکا قدیم دور میں اہل ہند میں تعدد ازدواج کا جواز اور رواج تھا اور یہ رواج 1955ء کے ہندو میرج ایکٹ تک بھی برابر رہا۔ مگر 1955ء کے ایکٹ کے ذریعے ہندو مرد اور عورت دونوں کے لئے بیک وقت ایک سے زیادہ شادی کرنا قانوناً جرم قرار دیا گیا ہے۔ اس ایکٹ کے مطابق ضروری ہے کہ شادی کے وقت فریقین میں سے کسی ایک کے بھی میاں یا بیوی زندہ موجود نہ ہوں۔ ورنہ دوسری شادی نہ صرف باطل تصور کی جائے گی بلکہ یہ اقدام ہندو مرد اور عورت دونوں کے لئے قابل تعزیر جرم قرار پائے گا۔

(ماڈرن ہندو لا صفحہ 96، از ڈاکٹر پارس دیوان، الہ آباد، 1983ء)

اس طرح تعدد ازدواج کے جواز کا وہ قانون جو ہزاروں سال سے ہندوستان میں جاری اور رائج تھا۔ 1955ء کے ایکٹ کے ذریعے ہندوؤں کے لئے یکلخت منسوخ کر دیا گیا لیکن اس قانون کی منظوری کے بعد مختلف حلقوں میں اس کی مخالفت میں آوازیں بلند ہوئیں اور راؤ کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق اس بات کا خدشہ ظاہر کیا گیا کہ تعدد ازدواج پر پابندی کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ ناجائز تعلقات میں اضافہ ہو سکتا ہے بلکہ یہ اقدام تبدیلی مذہب کا بھی ایک محرک بن سکتا ہے جیسا کہ رپورٹ میں کہا گیا ہے۔

The arguments of the opponents were that monogamy would lead to increased concubinage and conversion to Islam which permits four wives, They were of the view that "if a man is healthy and wealthy he should be allowed to marry again" and "why should he be deprived of a right which has been enjoyed by him for three thousand years?" Bagga, V. (Ed) Studies in the Hindu, Marriage and the Special

Marriage Acts. P.261 Bombay, 1978.

ترجمہ: مخالفین کا استدلال یہ ہے کہ یک زوجگی ناجائز تعلقات میں اضافے اور اسلام کے اختیار کرنے کا باعث بن سکتی ہے جو چار بیویوں کے رکھنے کی اجازت دیتا ہے۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر ایک آدمی صحت مند اور مالدار ہے تو اسے دوبارہ (دوسری) شادی کرنے کی اجازت ملنی چاہئے اور اسے اس حق سے کیوں کر محروم رکھا جا سکتا ہے جس کا فائدہ وہ تین ہزار سال سے اٹھا رہا ہے۔

اور یہ محض ایک خدشہ ہی نہیں بلکہ بعد میں رونما ہونے والے واقعات کے باعث ایک حقیقت ثابت ہوا۔ چنانچہ اس قسم کی متعدد رپورٹیں موجود ہیں کہ اس پابندی کی بنا پر بہت سے لوگوں نے تعدد ازدواج کا فائدہ اٹھانے کے لئے مذہب اسلام میں پناہ لی چونکہ ملک کے قانون کے مطابق تبدیلی مذہب پر کوئی پابندی نہیں ہے اور نہ ہی اس کے اسباب و محرکات کی چھان بین کا کوئی ذریعہ ہے اور نہ کسی کو اس کا اختیار ہی حاصل ہے بلکہ اس قسم کی چھان بین کا سوال ہی خارج از بحث ہے۔

When the laws of the country do not prohibit its people to freely renounce their religion and embrace another, the question of motive behind the conversion becomes irrelevant, Ibid, P.282.

غرض ہندو میرج ایکٹ 1955ء کی دفعہ 17 کا اطلاق جس کی رو سے دو زوجگی (Bigamy) یعنی بیک وقت دو بیویاں رکھنا، دو ہندوؤں تک محدود ہے، جنہوں نے باضابطہ طور پر (ہندو قانون کے پورے رسم و رواج کے مطابق) شادی کی ہو اور اس شادی کے وقت زوجین میں سے کسی کا شوہر یا بیوی پہلے سے موجود ہو۔ نتیجہ یہ کہ اس دفعہ کا اطلاق اس زوج (شوہر یا بیوی) پر نہیں ہوتا جس نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

The application of Section 17 of the 1955 Act (Hindu Marriage Act) which provides for punishment of bigamy is limited to two hindus

solemnizing marriage if at the date of sduch marriage either party had a husband or wife living. Consequently this section shall not apply to a spouse converted to Muslim religion Ibid, P.291.

اس دفعہ میں ایک قانونی نقص یہ ہے کہ اس میں ایک ہندو کی دوسری شادی کے لئے "باضابطہ" ہونے کی قید لگی ہوئی ہے اور اس سے مراد وہ شادی ہے جو ہندو دھرم کے مطابق پورے رسم و رواج کے ساتھ ادا ہوئی ہو جس کے لئے اس موقع پر SOLEMNIZE کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ ہندو مذہب کے مطابق ایسی چند خاص رسمیں ہیں۔

ان رسوم کی تفصیل کے لئے دیکھئے ڈاکٹر پارس دیوان کی کتاب "ماڈرن ہندو لا" صفحہ 80، مطبوعہ الہ آباد 1982ء)

کہ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی چھوٹ جائے تو وہ باضابطہ شادی نہیں کہلاتی۔ لہٰذا دوسری شادی کرنے والے میاں یا بیوی سزا کے مستحق صرف اسی وقت ہو سکتے ہیں جب کہ یہ ثابت ہو جائے کہ دوسری شادی پورے رسم و رواج کے ساتھ ہوئی تھی۔

پہلے ہندو معاشرے میں قانوناً تو نہیں بلکہ رواجی طور پر عورت بھی متعدد شوہروں والی ہوا کرتی تھی، لہٰذا کثیر زوجگی (POLYGAMY) کے ساتھ ساتھ کثیر شوہری (POLYANDRY) کو بھی روکنے کے لئے یہ قانون بنایا گیا ہے۔

Before a person can be found punishable under this section (Section 17) it is necessary to determine the fact whether there had been a subsequent marriage of a spouse during the lifetime of the other spouse. From that point it has to be determined whether the prior marriage was duly solemnized, In case where either of the

two marriages is found to be not duly solemnized the position is that in the eye of the law there is only one legal and valid marriage making the charge of bigamy unsustainable. The word "solemnize" means to celebrate the marriage with prop r ceremonies and in due form. It follows therefore that unless the marriage is celebrated or performed with proper ceremonies and in due form it cannot be said to be solemnized.

Desai, Kumud, Indian Law of Marraige and Divorce, Fourth Edition, P.103 Bombay, 1981

اس اعتبار سے اگر ایک شادی "باضابطہ" اور دسری "بے ضابطہ" ہوجائے تو اس صورت میں قانون کچھ بھی نہیں کرسکتا بلکہ اس سلسلے میں زوجین کا مجرد اقبال بھی انہیں قانون کی گرفت میں نہیں لاسکتا کہ انہوں نے دوسری شادی کرلی ہے۔ اس طرح ایک ہندو کے لئے اب دوسری شادی پر قانوناً پابندی عائد ہونے کے باوجود اسے پوری طرح آزادی حاصل ہے کہ وہ اس قانونی نقص کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یا تو حیلہ سازی اختیار کرے۔ یعنی کسی ضروری رسم کو ادا نہ کرے یا پھر وہ اسلام کی آغوش میں پناہ لے۔ اس طرح یہ دو دروازے ہر ہندو کے لئے پوری طرح کھلے ہوئے ہیں۔ لہٰذا اب اسے قانون کی کوئی پرواہ نہیں ہے کیونکہ وہ اس معاملے میں بالکل بے اثر بن کر رہ گیا ہے۔

یکساں سول کوڈ کا ایک پس منظر

اصل میں یہ ہندو قانون کا اتنا بڑا نقص ہے کہ وہ اس کی بنا پر آج صحیح معنوں میں ایک دوراہے پر کھڑا ہوا ہے اور ہندو قانون دان حیران ہیں کہ اس "نئی افتاد" کا کیا کیا جائے؟

ایک طرف وہ مغرب کی پیروی میں تعدد ازدواج پر پابندی بھی لگانا چاہتے ہیں اور دوسری طرف اپنے مذاہب و قانون کے نقائص بھی دور کرنا چاہتے ہیں۔ مگر جیسے جیسے وہ "اصلاح" کی طرف بڑھ رہے ہیں ویسے ویسے وہ مزید مشکلات سے دوچار ہوتے جارہے ہیں اور حال یہ ہے کہ اب قانون دانوں کا ذہن ماؤف ہو چکا ہے اور عقل کام نہیں کر رہی۔ لہٰذا اب ان کے سامنے بس ایک ہی راستہ رہ گیا ہے کہ کسی نہ کسی طرح ہندوستان میں یکساں (یونیفارم) سول کوڈ نافذ کر کے "جھگڑا" ختم کردیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ماہرین قانون حکومت کو جو مشورہ دے رہے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ ان نقائص کو دور کرنے کے لئے فوراً یکساں مدنی قانون (یونیفارم سول کوڈ) پورے ملک میں نافذ کردے، تاکہ اس باب میں ہندو، مسلمان، عیسائی اور پارسی سب برابر ہوجائیں اور پھر کسی کو "اِدھر اُدھر" ہونے کی گنجائش ہی نہ رہ جائے۔

نیز اس سلسلے میں ایک تجویز یہ بھی ہے کہ جب تک یکساں سول کوڈ نافذ نہ ہوجائے۔ اس وقت تک بعض ایسے قوانین کا سہارا لینا چاہیے جن کی بنا پر تبدیلی مذہب پر پابندی عائد ہوتا کہ کوئی پہلی شادی کے برقرار رہتے ہوئے دوسری شادی نہ کرسکے۔ جیسا کہ ایک قانون دان نے حکومت کو مشورہ دیتے ہوئے تحریر کیا ہے۔

Until Uniform rules of monogamy are enacted for the country, provisions may be made by statutory enactment removing the change of religion as a gruond of matrimonial reliefs and putting restriction on the spouse who changes religion to contract another marriage so long as his firts marriage subsists. 36

Bagga, V (Ed) Studies in the hindu Marriage and Special Marriage Acts, P.294 Bombay 1978.

اس طرح اب ہندو قوم اپنے مذہب کی اصلاح کی آڑ میں دوسرے مذاہب پر بھی

حملہ آور ہونا چاہتی ہے۔ گویا کہ اپنے مذہب کا ''تاوان'' دوسرے مذاہب پر عائد کرنا چاہتی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ علمی و اخلاقی اعتبار سے نہ صرف ایک نامعقول اور ناشائستہ حرکت ہوگی بلکہ خود قانونی اور دستوری اعتبار سے بھی دیگر مذاہب میں ایک مداخلت تصور کی جائے گی جس کا حکومت یا اس کے اداروں کو کوئی حق حاصل نہیں ہے بلکہ یہ حرکت ''کرے کوئی بھرے کوئی'' کا مصداق ثابت ہوگی۔

بہر حال قانون دان اس سلسلے میں مختلف اندازوں سے سوچ رہے ہیں۔ اب دیکھئے یہ اُونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے! مگر یہ بات تو طے ہے کہ خلاف فطرت فیصلہ کرنے والوں کو منہ کی کھانی پڑتی ہے کیونکہ اس کے نتیجے میں جنسی انحرافات کا ایسا سیلاب آئے گا جو سارے انسانی اقدار (Human Values) کو اپنے ساتھ بہالے جائے گا۔

نقص اور تضاد، انسانی قانون کا لازمہ

اصل میں یہ اور اس قسم کے تمام نقائص انسانی قوانین کا لازمہ ہیں۔ انسان کی عقل، محدود اور اس کے تجربات محدود ہیں، لہٰذا وہ کسی چیز کی اچھائی یا برائی کا خود فیصلہ ہرگز نہیں کرسکتا بلکہ اسے اس سلسلے میں اللہ کی رہنمائی حاصل کرنا قدم قدم پر ضروری ہے۔ انسان کے بنائے ہوئے قوانین تو چند دن بھی چل نہیں سکتے۔ مثال کے طور پر خود 1955ء کے ہندو میرج ایکٹ ہی کو لے لیجئے، جس میں موجود نقائص کو دور کرنے کے لئے 1976ء کے قوانین شادی (ترمیمی) ایکٹ کو نافذ کرنا پڑا۔ مگر اس کے باوجود اب بھی اصلاح کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ مستقبل میں یہ قانون ''اصلاح در اصلاح'' سے دوچار نہ ہوگا؟

The Marriage Laws (Amendment) Act, 1976

انسانی قانون کا سب سے بڑا لازمہ نقص کے ساتھ ساتھ تضاد (Contradiction) بھی ہے اور اس کا بھرپور نمونہ نفقہ (Maintenance) کے سلسلے میں حکومت ہند کے بنائے ہوئے متعدد قوانین کے درمیان دیکھا جاسکتا ہے، جو یہ ہیں۔

1- اسپیشل میرج ایکٹ 1954ء

2- ہندو میرج ایکٹ 1955ء

3- ہندو اڈاپشن اینڈ مینٹی نینس ایکٹ 1956ء

4- کریمنل پروسیجر کوڈ یعنی ضابطہ فوجداری 1973ء

یہ چاروں ایکٹ عدم یکسانیت کے باعث تعارض و تضاد سے بھرپور ہیں۔ کسی میں کچھ ہے تو کسی میں کچھ اور ان میں قانونی الجھاوے اور پیچیدگیاں اس قدر ہیں کہ وہ ایک اچھا خاصہ معمہ یا چیستان معلوم ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ایک قانون دان اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہے ان کی تشریح کرسکتا ہے۔ اگر کسی ایکٹ میں عورت کو اس کا یہ ''حق'' نہ ملے تو اسے کسی دوسرے ایکٹ کے تحت دلوا سکتا ہے۔

چنانچہ اس قانون کا ایک تضاد ملاحظہ ہو کہ جہاں ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ طلاق فسخ (Nullity) اور ابطال نکاح (Annulment) ان تینوں صورتوں میں عورت بیوی نہیں رہتی اور اسے نفقہ حاصل کرنے کے لئے دعویٰ کرنے کا کوئی اختیار نہیں رہتا۔ مگر معاً یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چونکہ عورت کو بے سہارا چھوڑا بھی نہیں جاسکتا اس وجہ سے اسے مستقل نفقہ دینا ضروری ہوگا۔

......in case of divorce, nullity and annulment the marriage is completely ended, in these instances the women is no more a wife and so has no valid claim to maintenance, in order that the women may not be left unprotected, Hindu Marriage Act provides that the relief of permanent maintenance may be granted in case any primary relief is granted under the act.

Agarwala, Raj Kumari, Katrimonial Remodies under Hindu Law P.113 Bombay 1974.

یعنی ایک طرف ایک عورت کا کوئی حق بھی نہیں ہے، مگر دوسری طرف اسے یہ حق پوری

طرح حاصل بھی ہے، معلوم نہیں یہ قانون مطابق عقل کس طرح ہوا؟

غرض ہندو میرج ایکٹ کا ایک بہت بڑا نقص یہ بھی ہے کہ عورت کے بانجھ یا کسی دائمی مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود کسی کو دوسری شادی کرنے کی اجازت نہیں ہے جیسا کہ قدیم ہندو قانون کے مطابق اس کی اجازت تھی بلکہ اس صورت میں اسے پہلی بیوی کو طلاق دینی پڑے گی، ورنہ دوسری شادی نہیں ہو سکتی اور پھر لطف یہ ہے کہ طلاق دینے کے باوجود اسے پہلی بیوی سے پوری طرح چھٹکارا بھی نہیں مل سکتا کیونکہ اس کے گلے میں "نفقہ کی زنجیر" پڑی رہے گی۔ یعنی پہلی بیوی کو طلاق دینے کے بعد اسے عمر بھر نفقہ بھی دینا پڑے گا اور اس موقع پر قانون کو اس سے کوئی بحث نہیں ہے کہ ایسی بانجھ یا دائم المریض مطلقہ کا حشر...... مستقل نفقہ پانے کے باوجود...... کیا ہوگا؟ آیا وہ کسی قریبی عزیز کے نہ ہونے کی صورت میں خود سے ایک "محفوظ" اور باعزت زندگی بسر کر بھی سکے گی یا نہیں؟ مگر یہ تو صاف ظاہر ہے کہ ایسی "علت زدہ" عورت کی دوسری شادی ہونے سے تو رہی۔ اس لحاظ سے ظاہر ہے کہ ایک کمزور اور ناتواں عورت پر یہ ایک ظلم ہوگا کہ اسے ایک ناکردہ گناہ کی سزا کے طور پر بالکل بے سہارا چھوڑ دیا جائے یا در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا جائے۔ آخر اس میں اس بیچاری عورت کا کیا قصور ہے؟ اور اسے کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا بانجھ یا دائم المریض ہونا اس کا ایک فطری و طبعی نقص ہے، جس میں اس کا اپنا کوئی قصور نہیں ہے۔ تو کیا قانون اتنا ظالم اور بے رحم بھی ہو سکتا ہے کہ کسی عورت کو اس کی نام نہاد "عزت نفس" کے نام پر اسے فٹ پاتھ پر دھکیل دیا جائے؟ آخر اس میں کون سی معقولیت ہے؟ یہ عورت کی تکریم نہیں بلکہ اس کی توہین ہے۔ اگر کوئی شخص ایک "علت زدہ" بیوی کو اپنے ساتھ رکھتے اور اس کی خبر گیری پوری طرح کرتے ہوئے ایک دوسری شادی کرتا ہے تو آخر اس میں برائی کیا ہے؟ اور ان دونوں کو علیحدہ کرنے میں کون سی دانشمندی ہے؟ ظاہر ہے کہ اس قسم کا اقدام ایک ایسی مطلقہ کو بدکاری یا جنسی انحراف (Sexual Deviation) پر مجبور کر سکتا ہے۔ لہٰذا یہ ایک مہمل اور غیر معقول قانون ہے جو محض مغرب کی نقالی اور "آزادی نسواں" کی نام نہاد تحریک کے دباؤ اور مرعوبیت کا نتیجہ ہے۔

نیز عصر جدید کا یہ بھی ایک عجیب وغریب تضاد ہے جو سمجھ سے باہر ہے کہ ایک طرف

آزادی نسواں کے علمبردار جہاں ایک طرف مرد اور عورت کی مکمل مساوات اور برابری کا دعویٰ کرتے ہیں تو دوسری طرف طلاق کی صورت میں عورت کو مرد سے عمر بھر یا تا نکاح ثانی نفقہ بھی دلاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر عورت ہر اعتبار سے مرد کے برابر ہے تو اس کا مرد سے تعلق منقطع ہو جانے کے بعد نفقہ طلب کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ بلکہ یہ اقدام ثابت کرتا ہے کہ عورت ہرگز مرد کے برابر نہیں ہے۔ لہٰذا "ترقی پسند" لوگ ہمیں ذرا بتائیں کہ اس منطق کی آخر کیا معقولیت ہے؟

تعدد ازدواج اور حیلہ سازی

1955ء کے ہندو میرج ایکٹ کے تحت دراصل قدیم ہندو قانون کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا گیا ہے۔ اب نہ تو وہ صحیح معنی میں ہندو قانون ہے اور نہ ہی اصلاحی قانون۔ پھر طرفہ یہ کہ اب اس کی حیثیت محض ایک کاغذی قسم کی بن کر رہ گئی ہے جس کا عملی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ اب ہندو قوم...... چور دروازوں سے حسب معمول تعدد ازدواج کا کاروبار جاری رکھے ہوئے ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں بعض عجیب وغریب حیلے اور مثالیں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ 1955ء سے پہلے ایسا ہوتا تھا کہ عیسائی لوگ اپنے مذہب کی تنگ دامانی کے باعث نکاح ثانی کے لئے اسلام یا ہندو مذہب اختیار کر لیتے تھے۔ مگر 1955ء کی پابندی کے بعد ہندو لوگ مسلمان بن کر دوسری شادی رچانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اس سلسلے کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(1) 1907ء میں ایک مقامی عیسائی نے (جس کی بیوی زندہ تھی) ایک ہندو عورت سے ہندو رسم ورواج کے مطابق اپنا مذہب تبدیل کئے بغیر شادی کر لی، تو مدراس ہائی کورٹ نے اس کو دو زوجگی (Bigamy) کا مجرم ٹھہرایا کیونکہ ایک عیسائی کے لئے دوسری شادی جائز نہیں ہے۔ (دی ہندو میرج اینڈ اسپیشل میرج ایکٹ صفحہ 288)

(2) 1910ء میں ایک دوسرے مقدمے میں مدراس ہائی کورٹ نے، ایک عیسائی کے بارے میں جس کی ایک عیسائی بیوی موجود تھی، اس نے ہندو مذہب اختیار کر کے ایک ہندو عورت سے ہندو رسوم کے مطابق شادی کر لی، تو یہ فیصلہ دیا کہ وہ دو زوجگی کا مجرم نہیں

ہے۔(دی ہندومیرج اینڈ اسپیشل میرج ایکٹ صفحہ 288)

(3) 1950ء کے دہے میں میسور اور مدراس کے ہائی کورٹوں نے فیصلہ دیا کہ ایک ہندو جو عیسائی مذہب اختیار کر چکا ہے، اگر وہ دوسری شادی کرنے کے لئے پھر سے ہندو مذہب اختیار کرلے تو وہ انڈین پینل کوڈ کی دفعہ 494 کے تحت دوزوجگی کا مجرم نہیں گردانا جائے گا۔(دی ہندومیرج اینڈ اسپیشل میرج ایکٹ صفحہ 289)

(4) ایسے واقعات بھی موجود ہیں جن کے مطابق وہ لوگ جو کثیر زوجگی والے مذاہب سے تعلق رکھتے تھے، انہوں نے انگلینڈ میں یک زوجگی کی رجسٹرڈ شادیاں کیں پھر ہندوستان واپس آ کر اپنے پرسنل لا کے مطابق (پہلی شادی کے باقی رہتے ہوئے) دوسری شادی کی۔ ایسے لوگوں کو بھی دوزوجگی کا مجرم نہیں ٹھہرایا گیا۔ (دی ہندومیرج اینڈ اسپیشل میرج ایکٹ صفحہ 290)

(5) ایک عجیب سی صورت حال اس وقت پیدا ہو جاتی ہے جب ایک شوہر (پہلی ہندو بیوی کے ہوتے ہوئے) اسلام قبول کرکے اسلامی قانون کے مطابق کسی ایسی ہندو لڑکی سے شادی کرلیتا ہے جو شادی سے پہلے اسلام قبول کر چکی ہو۔ پھر شادی کے کچھ عرصے بعد وہ دونوں پھر سے ہندو مذہب اختیار کر لیتے ہیں۔ (نتیجہ یہ کہ) دونوں شادیاں باضابطہ طور پر صحیح ہوتے ہوئے بھی شاید وہ ہندو میرج ایکٹ 1955ء کے تحت دوزوجگی کے دائرہ سے باہر ہیں۔ (دی ہندومیرج اینڈ اسپیشل میرج ایکٹ صفحہ 294)

اسی طرح اسلام کے جائز کردہ تعدد ازدواج یا کثیر زوجگی کے علاوہ اس کا قانون طلاق بھی آسان ضوابط پر مشتمل ہے، جو دیگر مذاہب کے ضوابط کی طرح انتہائی مشکل اور پیچیدہ نہیں ہے، اس لئے غیر مسلموں کو جب کبھی طلاق کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ اپنے مذہب اور قانون کی الجھنوں سے نجات پانے کے لئے اسلامی قانون ہی کو باعث رحمت سمجھتے ہوئے یہی نسخہ آزماتے ہیں۔

مثال کے طور پر دیکھئے:

(6) دو افراد کی شادی ہندو قانون کے مطابق ہوئی تھی۔ (مگر بعد میں کسی وجہ سے) بیوی نے اسلام قبول کرکے ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں (طلاق کا) مقدمہ دائر کردیا، جس

کی وجہ سے یہ شادی مسلم لا کے مطابق منسوخ کردی گئی۔ پھر وہ دوبارہ ہندو مذہب میں لوٹ گئی اور ایک (دوسرے) ہندو سے (اپنی پسند کے مطابق) شادی کرلی۔

(دی ہندومیرج اینڈ اسپیشل میرج ایکٹ صفحہ 294)

(7) کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہندو مرد اور ایک ہندو عورت، جو آپس میں میاں بیوی، اپنے باہمی اختلاف کے باعث ایک دوسرے سے (نہایت سنجیدگی کے ساتھ) علیحدہ ہو جانے ہی میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ مگر ان کا مذہب اور قانون انہیں آسانی کے ساتھ جدا ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ لہٰذا وہ دونوں آپس میں سمجھوتہ کرکے پہلے اسلام قبول کرلیتے ہیں۔ پھر اسلامی قانون کے مطابق طلاق کے ذریعے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جانے کے بعد پھر دوبارہ ہندو مذہب میں لوٹ آتے ہیں اور اپنی اپنی پسند کی شادی دوبارہ کرلیتے ہیں۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ جب اسے کسی جائز چیز سے روک دیا جائے تو وہ دوسرے ذرائع اور حیلوں سے اسے حاصل کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ایک خلاف فطرت قانون بنا کر لوگوں کو اس پر چلانا بہت مشکل کام ہے۔ یہ فطرت کے خلاف ایک جنگ ہے جو کبھی جیتی نہیں جاسکتی۔ لہٰذا عقل کا تقاضا ہے کہ اس سلسلے میں توازن اور ہوش مندی سے کام لیا جائے، غلط تحریکوں اور پروپیگنڈوں کے دباؤ میں آ کر وقت، دماغ اور توانائیوں کو خواہ مخواہ برباد نہ کیا جائے۔

ایک آسان اور باعث رحمت قانون

اس پوری بحث سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی قانون نہ صرف ایک آسان اور ہر ایک کے لئے قابل عمل ضابطہ ہے بلکہ وہ افراط و تفریط یا اونچ نیچ سے عاری ہونے کی وجہ سے پوری دنیا کے لئے رحمت کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ چنانچہ دیگر قوموں کا بار بار اسلامی قانون کے دامن میں پناہ لینا (خواہ وہ دنیوی مقاصد ہی کے لئے کیوں نہ ہو) یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک مقبول عام اور عالمگیر قانون بننے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ سارے عالم کے لئے یکساں مدنی قانون (یونیفارم سول کوڈ) بن سکتا

ہے۔ لہٰذا اگر کوئی یونیفارم سول کوڈ بنانا ہی ہے تو پھر اسلامی قانون کو اس کے لئے منتخب کرنا چاہئے کیونکہ دنیا کے تمام عائلی قوانین (Family Law) میں یہی ایک واحد قانون ہے جو اپنی آسانی، توازن اور معقولیت کی بنا پر اس کے لئے موزوں تر ہوسکتا ہے۔ اس کے برعکس دیگر مذاہب اور قوموں کے قوانین اپنی مشکل پسندی، پیچیدگی اور عدم معقولیت کی بنا پر اس کی اہلیت نہیں رکھتے۔

غرض اسلامی قانون کی یہی وہ آسانی اور مقبولیت ہے جس کی وجہ سے حاسدین کے سینوں پر سانپ لوٹتے ہیں۔ لہٰذا وہ اسلامی قانون کے خلاف طرح طرح کے گندے اعتراضات تراش کر اس کی مقبولیت کو گھٹانا یا اس کی راہ میں روڑے اٹکانا چاہتے ہیں، جو محض ایک سیاسی حربہ اور شعبدہ بازی ہے۔

یہودی، اسلامی اور ہندو شرائع کا اتفاق

خلاصہ بحث کے طور پر دو باتیں پوری صراحت کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام واحد مذہب نہیں ہے جس نے ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دی ہو بلکہ قدیم و جدید دنیا کے اکثر و بیشتر مذاہب اور تقریباً تمام قوموں میں اس کا رواج رہا ہے اور جیسا کہ Murdock 1949ء کے حوالے سے گزر چکا آج بھی دنیا کے 554 معاروں میں سے 415 میں اس کا رواج پایا جاتا ہے اور دوم یہ کہ مسلمان باوجود شرعی و قانونی اجازت کے آج بھی عموماً یک زوجگی ہی کے پابند ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کے خلاف اس سلسلے میں کیا جانے والا پروپیگنڈا ایک سیاسی کرتب (STUNT) اور مغالطہ آرائی ہے۔

نیز اس بحث سے بخوبی ثابت ہوگیا کہ جس طرح یہودی اور اسلامی شریعتیں تعدد ازدواج کے جواز پر متفق ہیں، بالکل اسی طرح قدیم ہندو قانون و شریعت بھی اس کی موید ہے۔ اس طرح یہ تینوں شریعتیں اس باب میں متفق اللفظ ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں بعض جزئی اختلافات بھی پائے جاتے ہیں۔ مگر جہاں تک نفس جواز کا تعلق ہے اس میں اصولی طور پر کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لہٰذا عیسائیوں اور ان کی متابعت میں مغرب پرستوں

نیز مغرب پرست ہندوؤں کو اعتراض کا کوئی حق نہیں ہے...... اور جہاں تک موجودہ مغرب پرست ہندوؤں کا تعلق ہے تو ان کی تعدد ازدواج پر پابندی عائد کرنے کی کوششیں سوائے قلابازیاں کھانے کے اور کچھ بھی نہیں ہے اور اس اقدام میں سوائے ناکامی کے انہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ یہ خدائی شریعت ہے۔ جس کو بدلنے کا نتیجہ سوائے تباہی و بربادی۔ جنسی انارکی اور لاقانونیت کے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ خلاق عالم اپنی مخلوقات اور ان کے طبائع و مصالح کا علم زیادہ بہتر طور پر رکھتا ہے اور انسان اپنے ناقص علم و تجربے کی بنا پر خیر و شر کے درمیان کوئی حد فاصل قائم نہیں کرسکتا بلکہ عین ممکن ہے کہ وہ جس کو "شر" سمجھ کر نظر انداز کر رہا ہے وہ مجموعی اعتبار سے عین "خیر" ہو اور اسی طرح جس چیز کو وہ خیر سمجھ کر اختیار کر رہا ہے وہ عین شر قرار پا جائے۔ چنانچہ اس کا مشاہدہ ہمیں جدید دنیا کے سرعت کے ساتھ بدلتے ہوئے عائلی قوانین (Family Law) کے مطالعہ و مشاہدہ سے بخوبی ہوجاتا ہے۔ جن میں ہندوستان کے بدلتے ہوئے فیملی قوانین اور کوڈ بھی شامل ہیں۔ آج ایک قانون کو بہتر سمجھ کر اختیار کیا جاتا ہے تو کل اس کو ناکارہ تصور کر کے رد کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح آج جس قانون کو ناکارہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا تھا وہ کل نہایت درجہ موزوں نظر آنے لگتا ہے۔ غرض انسان مسلسل تجرباتی و ارتقائی دور سے گزر رہا ہے اور اس باب میں وہ اب تک کسی "ٹھہراؤ" یا "ثابت منزل" سے آشنا نہیں ہوسکا ہے۔

مگر اس کے برعکس یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ اسلامی قانون چودہ سو سال سے لے کر آج تک کسی قسم کے تزلزل یا ارتقاء سے نا آشنا ہوتے ہوئے بالکل تازہ دم نظر آرہا ہے۔ گویا کہ وہ ابھی ابھی نازل ہوا ہے۔ یہ رسول امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اعجاز اور اسلام کی صداقت و برتری کی ناقابل تردید دلیل ہے کہ آج دنیا کی تمام متمدن قومیں شعوری یا غیر شعوری طور پر آہستہ آہستہ اسلامی قوانین کی ضرورت و اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے انہیں کسی نہ کسی شکل میں قبول کرنے پر مجبور نظر آرہی ہے۔

اس اعتبار سے اہل ہند کو بھی ایک نہ ایک دن اسلامی قانون کو قبول کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک خوش آئند پہلو یہ ہے کہ 1955ء کے ہندو میرج ایکٹ میں طلاق وغیرہ کے سلسلے میں جو سختیاں موجود تھیں انہیں 1976ء کے ترمیمی ایکٹ

کے ذریعے بہت بڑی حد تک کم کردیا گیا ہے۔ جو دراصل اسلامی قانون ہی کی طرف ایک "پیش رفت" ہے۔ اگرچہ اسلامی قانون کو پوری طرح اختیار نہیں کیا گیا ہے۔ مگر بتدریج ہندو قانون اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہی حال مغربی دنیا کا بھی ہے کہ قدیم عیسائیت میں طلاق کے سلسلے میں جو سختیاں موجود تھیں وہ جدید قوانین میں کافی حد تک "نرم" کردی گئی ہیں۔ لہٰذا عصر جدید کا یہ بھی ایک بہت بڑا تضاد ہے کہ وہ ایک طرف اسلامی قوانین سے استفادہ بھی کررہا ہے تو دوسری طرف اسے برا بھلا بھی کہہ رہا ہے۔ اس دورنگی کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔

حاصل یہ کہ اسلامی قانون نہ تو فرسودہ ہے اور نہ دور وحشت کی نشانی بلکہ وہ خدائی قانون ہونے کی بنا پر ہر دور کے لئے صالح، معقول، متوازن اور معتدل ہے۔ نیز وہ ہر قسم کے تغیرات اور کمی بیشی سے بھی مامون و محفوظ پوری دنیائے انسانی کے لئے ایک آئیڈیل قانون ہے۔ اسی وجہ سے باوجود مخالفانہ و متعصبانہ ماحول اور تحریکوں کے صاف ذہن و فکر رکھنے والوں کو ہمیشہ متاثر کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا۔

نوٹ: تعدد ازدواج کے موضوع پر ایک مبسوط کتاب زیر تصنیف ہے، جس میں انشاء اللہ اس موضوع کے متعدد گوشوں پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے اسلامی قانون کی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور خاص کر اسلامی قانون پر کئے جانے والے اعتراضات کا معقول و مدلل جواب دیتے ہوئے تعدد ازدواج کے سلسلے میں سیرت رسولؐ کے تابناک پہلو کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو دنیائے انسانیت کے لئے ایک نمونہ ہے۔ نیز اس کے ساتھ ہی موجودہ مغربی تہذیب کے بگاڑ کو بھی نمایاں کیا گیا ہے جو تعدد ازدواج کے انکار کے باعث ایک جنسی سیلاب کی شکل میں رواں ہوگیا ہے۔ یہ بحث انشاء اللہ اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کے تقابل کے باعث موجودہ انسان کو ایک لمحہ فکریہ فراہم کرے گی کہ وہ ان دونوں میں سے کس کو اختیار کرے؟

وجودِ زن سے ہے کائنات میں رنگ

عورت تمدن انسانی کا مرکز و محور اور باغ انسانیت کی زینت ہے۔ عورت ہی کے دم

سے تہذیب و تمدن کی گاڑی رواں دواں ہے۔ عورت ہی اس کائنات مادی کا حسن اصلی ہے۔ عورت ہی کے دم سے زندگی کی بہار ہے۔ عورت ہی مرد کی زندگی میں نکھار لانے والی اور اس کی زندگی میں ہماہمی پیدا کرنے والی ہے۔ عورت ہی بزم زندگی کی شمع اور دلوں میں سوز و گداز پیدا کرنے والی ہے۔ عورت ہی کے وجود سے زندگی کے نغمے پھوٹتے ہیں اور مردہ دلوں میں ولولے بیدار ہوتے ہیں۔ یہ عورت ہی ہے جو مرد کو کارزار حیات میں تگ و دو کرنے اور جہد مسلسل میں منہمک رہنے پر مجبور کئے رہتی ہے۔ عورت ہی کی بدولت مرد ریگزاروں کو گلزاروں اور گلستانوں میں تبدیل کرکے زندگی کو ہر آن اور ہر لمحے ایک نیا رخ دینے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ غرض عورت مرد کو ہر آن اور ہر لمحے معروف عمل رکھتی ہے جس کی وجہ سے تہذیب و تمدن کے نئے میدان کھلتے ہیں اور نئی نئی منزلیں سامنے آتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے عورت کو حسن و جمال اور سوز و گداز سے نوازا ہے جو مرد کی تسکین قلب کا باعث اور اس کی تنہائیوں کو دور کرکے روحانی سکون کا ذریعہ بنتی ہے۔ اس اعتبار سے عورت مرد کی مونس و غمخوار اور اس کے سکون قلب کا باعث ہے۔ اللہ نے مرد کو جسمانی اعتبار سے قوی ہیکل اور مضبوط و طاقتور بنایا ہے تاکہ وہ کارزار حیات میں سخت سے سخت محنت و مشقت کے کام کرسکے۔ اس کے برعکس عورت کو نرم و نازک اور گداز جسم والی بنایا ہے جو گھر کے ہلکے پھلکے کام کرسکے اور خاص کر مرد کا دل لبھا کر اسے سکون و تازگی بخش سکے، تاکہ وہ جہد مسلسل میں برابر منہمک رہے اور اپنے وظیفہ حیات سے اکتا نہ جائے۔ ورنہ تمدن انسانی کی گاڑی رواں دواں رہنے کے بجائے بالکل ٹھپ ہوکر رہ جائے گی۔ اس اعتبار سے عورت حقیقتاً تمدن انسانی کا مرکز و محور اور باغ انسانیت کی زینت ہے۔ اس کے بغیر مرد کی زندگی بالکل سونی اور بے مزہ سی ہے۔ اگر عورت نہ ہو تو پھر سارا معاشرہ اور سارا تمدن منتشر و پراگندہ ہوجائے گا اور پوری انسانی تہذیب اجڑ کر رہ جائے گی۔

مرد و عورت دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں اور انسان ہونے کی حیثیت سے دونوں برابر برابر ہیں۔ اسلام نے اگرچہ مردوں کی بالادستی ضرور تسلیم کی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ عورتوں کے حقوق کی بھی نگہداشت کی ہے۔ چنانچہ ایک مختصر ترین جملہ میں اس نے نہایت درجہ فراخ دلی کے ساتھ وہ سب کچھ عطا کردیا ہے جس کی وہ مستحق ہیں۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (سورۃ بقرہ آیت 228) اور معروف طریقے سے عورتوں کے بھی ایسے ہی حقوق ہیں جیسے کہ ان پر عائد ہوتے ہیں۔

اس اعتبار سے عورت اسلام کی نظر میں کمتر یا ادنہ درجے کی مخلوق نہیں بلکہ نہایت ہی معزز اور باوقار شخصیت کی حامل ہے۔ مگر زمانہ حال کے بعض رسم ورواج اور خاص کر فرمائشی جہیز اور گھوڑے جوڑے کی خرافات کی وجہ سے آج ہندوستانی معاشرہ میں عورت کی عزت دو کوڑی کی بھی نہیں رہ گئی ہے بلکہ وہ ترکاری کے بھاؤ بک رہی ہے، فرمائشی جہیز اور جوڑے گھوڑے کا رواج ایک بدترین رواج ہے، جو نہ صرف خلاف شریعت ہے بلکہ یہ خرافات حقیقتاً فساد تمدن کا باعث ہے کیونکہ نظام فطرت کے مطابق مرد طالب اور عورت مطلوب ہوتی ہے اور اللہ نے مرد کو جسمانی اعتبار سے قوی ہیکل اور مضبوط و طاقتور اس لئے بنایا ہے کہ وہ جہاد زندگی میں حصہ لے کر معاشی بار بوجھ کو از خود برداشت کرنے کے قابل بن سکے۔ مگر جہیز اور جوڑے گھوڑے کے رسم ورواج کے باعث یہ ترتیب الٹ جاتی ہے اور مرد بجائے طالب ہونے کے مطلوب اور عورت بجائے مطلوب ہونے کے طالب بن جاتی ہے۔ گویا کہ عورت کی ضرورت مرد کو نہیں بلکہ مرد کی ضرورت عورت کو ہے۔ حالانکہ عقلی و فطری اعتبار سے عورت مرد کے یہاں جا کر اس کی "قیدی" و محبوس بن کر اس کا گھر بساتی ہے۔ بچے شرعی و قانونی اعتبار سے مرد کے ہوتے ہیں، عورت کے نہیں، عورت نہ صرف اپنے شوہر کی خدمت اور اس کے حقوق کی دیکھ بھال میں مشغول رہتی ہے بلکہ بچے ہونے کی صورت میں بچوں کی بھی خادمہ بن کر ان سب کے حقوق ادا کرتی ہے جو شرعی و قانونی اعتبار سے بچوں کا مالک ہوتا ہے اس اعتبار سے عورت کا اپنا کچھ نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف شوہر اور اس کے بچوں کی خدمت میں لگی رہتی ہے اور ان سب کے حقوق ادا کرتی رہتی ہے۔ لہٰذا جو ہستی کسی دوسرے کا گھر بسا رہی ہو اور اس کے فوائد کے لئے خود کو وقف کر چکی ہو اس پر کسی دوسرے طریقے سے مالی بوجھ ڈالنا یا "مالیات کا شعبہ" بھی اس کے حوالے کرنا عورت پر عورت کی فطرت و طاقت سے بڑھ کر ایک زائد بوجھ بلکہ ایک بہت بڑا سماجی ظلم ہے۔ جس کی وہ ہرگز متحمل نہیں ہو سکتی بلکہ اس سے نظام تمدن میں خلل پیدا ہوگا اور ایسا معاشرہ کبھی پنپ نہیں سکے گا۔

خلاق فطرت نے عورت اور مرد کا دائرہ کار الگ الگ بنایا ہے۔ چنانچہ اس نے مرد کو ایسا جسم اور ایسی صلاحیت عطا کی جس سے عورت محروم ہے اور عورت کو ایسا جسم اور ایسی صلاحیت عطا کی جس سے مرد محروم ہے۔ اس اعتبار سے ایک کو دوسرے کے دائرے میں لانے کی کوشش کرنا نظام تمدن کو بگاڑنا ہے۔

جہیز اور جوڑے گھوڑے کا مطالبہ دو حیثیتوں سے برا ہے۔ ایک یہ کہ شریعت میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے بلکہ یہ درحقیقت ایک غیر شرعی فعل ہے اور اس غلط رسم ورواج کی وجہ سے معاشرہ میں تباہی آئی ہوئی ہے اور غریب لڑکیوں کی شادی ایک نہایت مشکل مسئلہ بن گئی ہے کیونکہ نکھے اور لالچی مرد کسی ایسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے جو غریب ہو اور جہیز میں کوئی چیز نہ لاسکتی ہو۔ گویا کہ شادی کے لئے لڑکی نہیں بلکہ مال و دولت مطلوب ہے۔ حالانکہ مال و دولت کا مقصد نکاح سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

اور دوسری بات یہ کہ جہیز اور جوڑے گھوڑے کے رواج کی وجہ سے آج کل کے نوجوانوں میں کام چوری اور عیاشی کا جذبہ فروغ پا رہا ہے۔ چنانچہ اکثر نوجوان یہ چاہتے ہیں کہ بغیر ہاتھ پیر ہلائے لڑکی کے ساتھ مفت میں ڈھیر سارا مال اور سامان عیاشی مہیا ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس سے نہ صرف کاہلی اور کام چوری کے جذبات فروغ پائیں گے بلکہ یہ چیز دراصل نظام تمدن میں فساد برپا کرنے والی ہوگی کیونکہ تمدن کے فروغ اور اس کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ انسان خود سے محنت کرے اور ہاتھ پیر ہلا کر اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہونے کی کوشش کرے اور پھر جو مال مفت میں آتا ہے لوگ اس کی قدر نہیں کرتے بلکہ وہ عیاشی کی نذر ہو کر بہت جلد ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے "مال مفت دل بے رحم" چنانچہ موجودہ دور میں عیاشیوں اور خرمستیوں کی جو وبا پھیلی ہوئی ہے اس کی ایک بڑی وجہ مال مفت ہی ہے۔

عورت کا اصل جوہر اس کی نیک خصلتی اور اس کا حسن اخلاق ہے۔ چنانچہ ایک حدیث کے مطابق دنیا کا سب سے قیمتی اثاثہ ایک نیک خصلت بیوی ہے۔ اگر کسی کو ایک وفا شعار اور بااخلاق بیوی مل جائے تو پھر وہ دنیا کا سب سے زیادہ خوش قسمت انسان ہے، ورنہ اس کی زندگی جہنم کا ایک نمونہ بن کر رہ جائے گی۔ مگر جو لوگ عورتوں کی حسن سیرت کے

بجائے مال ومتاع کو ترجیح دیتے ہیں وہ اپنے پیروں پر آپ کلہاڑی مار لیتے اور اپنی زندگی کو عذاب میں بدل لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک نیک سیرت بیوی کی قدر نہ کرنا اپنی زندگی کو اپنے ہاتھوں تباہ کر لینا ہے۔ مال ومتاع سے سکون قلب حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب کہ اللہ نے عورت کو سکون قلب کے پیدا کیا ہے۔ (سورۃ روم 30، آیت 21)

جوڑے، جہیز کی قبیح رسومات حقیقتاً نظام فطرت کو بگاڑنے اور خدائی قانون وشریعت میں رخنے ڈالنے والی ہیں لہٰذا ان سے اجتناب ضروری ہے۔ یہ رسوم دراصل غیر مذاہب سے در آئی ہیں جو غیر اسلامی ہیں۔ لہٰذا آج اہل اسلام کو ان کے خلاف جہاد کرنا اور انہیں بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنا ضروری ہے۔ اہل اسلام ایک نظریاتی ملت ہیں، جن کا کام قوموں اور ملکوں کے غلط اور غیر معقول رسوم ورواجات کی تقلید نہیں بلکہ ان کی تردید ہے۔ مگر یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے کہ آج دیگر قوموں کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی اس بلا اور موذی مرض میں مبتلا نظر آرہے ہیں۔ جہیز اور جوڑے گھوڑے کی رسم حقیقتاً عصر حاضر کا سب سے بڑا منکر ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو جتنی جلد ہو سکے اس منکر کو ترک کر کے اس کے خلاف اعلان جہاد کرنا چاہئے۔ ورنہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مجرم وگنہگار قرار پائیں گے۔

زیر بحث مجموعے میں جہیز کے موضوع پر مختلف حیثیتوں سے روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کی قباحتوں اور مضرتوں کو واضح کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ ان مضامین سے اس کی شرعی حیثیت پوری طرح واضح ہو جائے گی۔

جہیز کی شرعی حیثیت

جہیز نہیں مہر معجل

اسلامی شریعت میں ایسی کوئی تصریح موجود نہیں ہے جس کی بنیاد پر عورت کے لئے جہیز ضروری قرار دیا گیا ہو۔ قرآن اور حدیث میں اس سلسلے میں کوئی ہلکا سا اشارہ تک موجود نہیں ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ الزہراؓ کو جو معمولی سی چیزیں عنایت فرمائی تھیں وہ بطور جہیز نہیں بلکہ حضرت علیؓ کی جانب سے ادا کئے گئے مہر معجل (پیشگی مہر) کے ذریعے خریدی ہوئی چیزیں تھیں۔ چنانچہ احادیث میں اس کی تفصیل مذکورہ ہے کہ

حضرت علیؓ نے مہر معجل کے طور پر ایک زرہ دی تھی، جس کی قیمت 480 درہم تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زرہ کو فروخت کرا دیا اور اس رقم سے بستر، تکیہ اور بعض چیزیں مہیا کیں۔ یعنی ایک چادر، پانی کا ایک مشک، ایک چکی اور دو گھڑے (سنن نسائی ومسند احمد)

جہیز ایک غیر شرعی چیز

ظاہر ہے کہ یہ جہیز نہیں تھا کیونکہ وہ مہر معجل کے پیسوں سے خریدا گیا تھا۔ لہٰذا اسے جہیز اور وہ بھی فرمائشی جہیز سے کیا نسبت ہو سکتی ہے؟ اور پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چار صاحبزادیاں تھیں، مگر سوائے حضرت فاطمہؓ کے دوسری کسی بھی صاحبزادی کے لئے اس قسم کی چیزیں یا "جہیز" دینا ثابت نہیں ہے اور نہ ہی دور رسالت یا دور صحابہ میں اس قسم کی کسی چیز کا ثبوت ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر شرعی حیثیت سے جہیز کی کوئی اہمیت ہوتی تو اسے قرآن اور حدیث میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا جاتا جیسا کہ اس سلسلے میں نکاح کے دیگر احکام وضاحت کے ساتھ مذکور ہیں۔ یا صحابہ کرام کے عمل کے ذریعے اس کی اہمیت اجاگر ہوتی۔ لہٰذا جو چیز قرآن اور حدیث سے ثابت نہیں ہے اور نہ ہی وہ صحابہ کرام کے عمل کے ذریعے ثابت ہے۔ اس پر اصرار کرنا اور جہیز نہ ملنے پر بہو کو طعنے دینا اور اس کا دل دکھانا اسے کسی قسم کی تکلیف پہنچانا سراسر ایک غیر شرعی اور غیر اخلاقی حرکت ہے اور اس قسم کا مطالبہ ناحق اور "اکل باطل" کے ذیل میں آتا ہے، جس کی قرآن حکیم میں مذمت کی گئی ہے۔ (سورۃ نساء 4، آیت 29)

داماد کے لئے سب سے بڑا تحفہ

لہٰذا مسلمانوں کو اس قسم کے مطالبات سے سخت پرہیز کرنا چاہئے۔ اگر لڑکی کے ماں باپ لڑکی کو کوئی چیز اپنی خوشی سے دے دیں تو وہ بالکل جائز ہے اور اگر نہ بھی دیں تو ان پر کوئی الزام نہیں ہے مگر اس سلسلے میں لڑکے والوں کی طرف سے کسی قسم کا مطالبہ کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ لڑکے والوں کو اس قسم کا مطالبہ کرنے کا کوئی شرعی یا اخلاقی جواز نہیں ہے اور یہ چیز مقصد نکاح کے بھی خلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ سسر کی جانب سے داماد کے لئے جو سب سے

بڑا تحفہ ملتا ہے وہ اس کی اپنی لڑکی ہوتی ہے، جسے جنم دینے کے بعد اس کی پرورش اور اس کی تعلیم و تربیت پر اس نے اپنا سب کچھ لٹا دیا ہے اور اس راہ میں حد درجہ تکلیفیں برداشت کر کے اسے اپنے خون جگر سے پالا پوسا ہے اور پھر اس کے بالغ ہونے کے بعد اپنے سینے پر صبر کی سل رکھ کر اسے دوسرے کے حوالے کر رہا ہے۔ گویا کہ اس نے اپنے داماد کا گھر بسانے کے لئے اس راہ میں بے انتہا دکھ سکھ برداشت کئے ہیں۔ لہٰذا اس قیمتی تحفے کے حصول کے بعد داماد کو اپنے سسر کا ممنون و مشکور ہونا چاہئے۔ مگر اس کے برعکس محض اپنی عیاشی کے لئے الٹے گھوڑے جوڑے اور فرمائشی جہیز وغیرہ کا مطالبہ کرنا حد درجہ غیر معقول بلکہ ایک شرمناک حرکت ہے، جس کا شرعی و اخلاقی کسی اعتبار سے کوئی جواز نہیں ہے بلکہ اس قسم کا غیر معقول اور ناجائز مطالبہ غضب الٰہی کو دعوت دینے والا ہے۔

ایک خوفناک رواج

جہیز کا رواج دراصل ایک ہندو تصور ہے جس کا اسلام میں کوئی وجود نہیں ہے۔ لہٰذا اسلام کے نام لیواؤں کو ان غیر شرعی رسوم کو ترک کر کے دنیا کے سامنے صحیح اسلامی قانون کا نمونہ پیش کرنا چاہئے۔ بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا اہل اسلام کی شان کے خلاف ہے اس منحوس رواج کو ختم کرنے کے لئے انہیں اس راہ میں جہاد کرنا چاہئے۔ ورنہ یہ قبیح اور خوفناک رسم ختم نہیں ہو سکتی جس نے ہزاروں لاکھوں گھرانوں کو جہنم کا نمونہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ نکاح کے ذریعے ایک نیا گھر بسانا مقصود ہوتا ہے۔ مگر جوڑے اور جہیز کے موجودہ غلط رواج نے بجائے نئے گھروں کو بسانے کے بھرے گھروں کو اجاڑنے اور انہیں آگ لگانے کا "کاروبار" بنا کر رکھ دیا ہے اس طرح آج ہزاروں گھر ماتم کدے بنے ہوئے ہیں اور ہاہا کار مچی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے طرز عمل کے باعث اللہ کریم کی رحمت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور اس کا غضب نازل ہوتا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو اس منحوس اور قاتل رواج سے تائب ہو کر صحیح اسلامی طور طریقے اختیار کرنا چاہئے۔ ورنہ پھر اپنی تباہی و بربادی کا شکوہ بیکار ہے۔

ناجائز مطالبات فساد تمدن کا باعث

نکاح کا رشتہ ایک مقدس و محترم رشتہ ہے جس کے ذریعے بہت سی دینی و دنیوی اور روحانی و جسمانی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے ان تمام باتوں کا لحاظ کرتے ہوئے خدا کے مقرر کردہ حدود کو قائم رکھنا ضروری ہے۔ جس کی قرآن مجید میں بار بار اور سخت تاکید آئی ہے مثلاً ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"یہ اللہ تعالیٰ کی (مقرر کردہ) حدود ہیں۔ تم ان سے تجاوز مت کرو۔" (سورۃ بقرہ 2 آیت 229)

ایک دوسرے موقع پر اللہ کے حدود سے تجاوز کرنے والوں کو ہمیشہ کے لئے جہنمی قرار دیا گیا ہے۔ "اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی حدود سے تجاوز کرے گا تو وہ اسے ہمیشہ کے لئے (جہنم کی) آگ میں داخل کر دے گا۔" (سورۃ نساء 4، آیت 14)

اور جوڑے جہیز کے مطالبات حدود الٰہی کو پھلانگنے ہی کے ذیل میں آتے ہیں، جن کا شریعت کی نظر میں ادنیٰ درجے کا بھی جواز نہیں ہے بلکہ یہ ناجائز مطالبات نکاح کے مقدس و محترم تمام رشتوں کو آن واحد میں کاٹ کر مختلف خاندانوں کو قصائی خانوں میں تبدیل کر دیتے ہیں اور تمام رشتے ناطے جوڑے جہیز کی سان پر چڑھ کر متحارب کیمپوں میں بٹ جاتے ہیں۔ نکاح کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے جن خاندانوں اور قبیلوں کے سسرالی رشتوں میں باندھ کر ایک دوسرے کا حلیف و مددگار بنا دیا تھا انہیں جوڑے جہیز کے غیر معقول اور شرمناک مطالبات نے ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا ہے اور پورے انسانی معاشرے کو آگ لگا دی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب حرص و آز، لالچ، خود غرضی اور پرائے مال پر نظریں جمانے کا لازمی نتیجہ ہے اور جس معاشرہ میں اس قسم کی سطحی بیماریاں موجود ہوں وہ کبھی پروان نہیں چڑھ سکتا۔

اہل اسلام کا فرض منصبی

لہٰذا اسلام کے نام لیواؤں کو ان سماجی خرافات کے خلاف علمِ جہاد بلند کرنا چاہئے کیونکہ اسلام ہی وہ واحد دین ہے جو سماجی نا انصافیوں کے خلاف لڑنے اور نوعِ انسانی کو بوجھل زنجیروں سے آزاد کرانے کے لئے آیا ہے۔ لیکن اگر خود اہل اسلام بجائے ان سماجی برائیوں کو دور کرنے کے انہی میں لتھڑ رہے ہیں تو پھر عالم انسانی کس کی راہ دیکھے گا اور لوگوں کو اصلاح کس طرح ہو سکے گی؟ یہ تمام مسلمانوں کے لئے ایک لمحہ فکریہ ہے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ دوسروں کی اصطلاح کرنے سے پہلے مسلمان خود ان سماجی بیماریوں سے دور رہیں اور خدا کا خوف کرتے ہوئے اس قسم کی غیر شرعی اور بے جا مطالبات کرنے سے باز آجائیں۔ ورنہ ظلم جب اپنی حدیں پار کرلے گا یا جب پاپ کا گھڑا بھر جائے گا تو عذاب الٰہی بھی دبے پاؤں آکر ایسی قوم کو تہس نہس کر کے رکھ دے گا۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے۔ ''اور ہم بستیوں کو اس وقت تک برباد نہیں کرتے جب تک کہ وہ ظالم نہ بن جائیں۔'' (سورۃ قصص 28 آیت 59)

اور اس میں اپنوں اور غیروں کی کوئی قید نہیں ہے بلکہ اللہ کا قانون سب کے لئے ایک اور یکساں ہے۔

اسلامی شریعت اور قانون جاہلیت

رسم جہیز کا ایک تاریخی جائزہ

اسلام ایک مکمل دین اور کامل دستور العمل ہے جس میں ایک مسلمان کے لئے زندگی گزارنے کے تمام طور طریقے بتائے گئے ہیں اور پوری وضاحت کے ساتھ تمام مسائل زندگی کا احاطہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ اسلامی شریعت میں جس طرح عقائد و عبادات کی وضاحت کی گئی ہے اسی طرح معاملات زندگی کی تفصیل بھی کی گئی ہے کہ انسان کو اپنی معاشرتی، اجتماعی اور تمدنی زندگی کس طرح گزارنی چاہئے اور افراد خاندان و معاشرہ کے ساتھ اس کے روابط کس طرح ہونے چاہئیں، تاکہ وہ ایک کامیاب زندگی گزار کر دنیا اور

آخرت میں سرخرو ہو۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ اسلام ہر اعتبار سے ایک مکمل دین اور مکمل شریعت کا حامل ہے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (سورۃ مائدہ 5 آیت 3) آج ہم نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو بحیثیت ایک دین کے پسند کیا۔

اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ جیسا کامل دین اور اس کی کامل شریعت کو چھوڑ کر کوئی دوسرا دین یا کوئی دوسرا طریقہ (شریعت) اختیار کرنا سخت مذموم اور قابل ملامت فعل ہوگا جو آخرت کے نقصان کا باعث ہوگا۔

وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَ هُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (سورۃ آل عمران 3 آیت 85) اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین چاہے گا تو وہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں زیاں کار رہنے والا۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (سورۃ آل عمران 3، آیت 19) اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔

یعنی مستند دین اور قابل اعتماد شریعت صرف اسلام اور اسلامی شریعت ہی ہے۔ کوئی دوسرا دین یا شریعت جسے قرآن میں دیگر مواقع پر قانون جاہلیت قرار دیا گیا ہے۔ مستند اور قابل اعتماد نہیں ہوسکتا۔ بلکہ مذکورہ بالا آیات کی رو سے غیر اسلامی شریعت اور غیر اسلامی رسوم سب جاہلی قانون قرار پاتے ہیں، جن سے ایک مسلمان کو اجتناب ضروری ہے۔ ورنہ وہ اللہ کا باغی و مجرم ہوگا اور آخرت کے نقصان سے دوچار ہوگا۔

اَفَحُکْمَ الْجَاهِلِیَّةِ یَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُکْمًا لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ (سورۃ مائدہ 5 آیت 50) کیا یہ لوگ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ اہل یقین کے لئے اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہوسکتا ہے؟

غرض اسلامی قانون کے مقابلے میں غیر اسلامی قانون اختیار کرنا ہر اعتبار سے باعث نقصان اور قابل مذمت ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ آج مسلمان بہت سے تہذیبی و

معاشرتی معاملات میں غیر اسلامی قوانین اور طور طریقے اختیار کر کے اسلام اور اسلامی قانون سے دور ہوتے جارہے ہیں اور ان میں سے ایک واضح چیز جہیز اور جوڑ گھوڑے کا رواج ہے۔ یہ رسم عطاً غیر اسلامی ہے، جس کا اسلامی شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جہیز کا تصور اصلاً ہندو مذہب سے آیا ہے جو آج پورے ہندوستانی معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے کر تباہی مچا رہا ہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس جاہلانہ قانون اور جاہلانہ طور طریقوں سے دور رہیں اور بجائے اصلاح معاشرہ کے تخریب معاشرہ کا باعث نہ بنیں۔ اہل اسلام کی حیثیت داعیانہ ہے مدعو کی سی نہیں۔ لہٰذا انہیں غیر اسلامی طور طریقوں سے اجتناب کرتے ہوئے اسلام کے متوازن اور عادلانہ قوانین کی تبلیغ کرنی چاہئے، جن میں ساری انسانیت کا بھلا ہے۔

جہیز ایک جاہلی قانون

آج جہیز اور جوڑے گھوڑے کے غلط رسم و رواج اور غلط طور طریقوں کا ناطقہ بند کر رکھا ہے اور معاشرے کے مختلف طبقات اس کی لپیٹ میں آ کر کراہ رہے ہیں اور جہیز کا یہ خوفناک دیوتا ہزاروں نوجوان لڑکیوں کو حرص و آواز کی بھینٹ چڑھا کر بے شمار خاندانوں کو تباہ و برباد کر چکا ہے اور لاکھوں عورتوں کو زندہ درگور بنائے ہوئے ہے۔ چنانچہ اس قسم کے واقعات سے اخبارات کے کالم بھرے رہتے ہیں جن میں اب کوئی ندرت نہیں رہ گئی ہے۔ ہر دن خودکشی یا خودسوزی کی کوئی نہ کوئی خبر ضرور ملتی رہتی ہے۔ یہ چیز موجودہ معاشرہ کے لئے کلنک کا ایک ٹیکہ ہے اور اس اعتبار سے یہ ایک نفرت انگیز رسم اور جاہلی قانون ہے جو ایک سماجی ناسور کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس بے رحم قانون کی بدولت نہ جانے کتنی معصوم اور پھول جیسی لڑکیاں اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو چکی ہیں! کتنی لڑکیوں کی زندگی اپنے ناکردہ گناہوں کے باعث ایک عذاب بنی ہوئی ہے!! اور کتنی دوشیزائیں اس مذموم اور خوفناک رواج کی بدولت بے بیاہی اپنے گھروں میں بیٹھی ہوئی ظالم سماج کو کوس رہی ہیں۔ مگر ظالم سماج ہے کہ معصوم و مظلوم لڑکیوں کی آہ و بکا اور ان کی گریہ وزاری سے بے نیاز ولا پرواہ ہو کر اپنی عیش کوشی اور بدمستی سے باز نہیں آ رہا ہے اور اسے سماج کے درمیانی اور کمزور طبقوں کی

مشکلات کا کوئی احساس ہی نہیں رہ گیا ہے۔ ہر طرف خود غرضی اور مطلب برآری کے جذبات فروغ پاتے نظر آ رہے ہیں۔ شادی عمر میں ایک بار ہوتی ہے اور اس میں ساری عمر کی پونجی صرف کر کے اکثر گھرانے ہمیشہ کے لئے فقیر اور کنگال بن جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں عوامی فلسفہ یہ ہے کہ شادی بیاہ چونکہ بار بار نہیں ہوتا اس لئے میں خوب (مسرفانہ حد تک) خرچ کیا جائے اور دل کی ساری حسرتیں اور سارے ارمان اس طرح پورے کر لئے جائیں کہ کسی قسم کی "کسر" باقی نہ رہ جائے۔ اس اعتبار سے اکثر و بیشتر شادیاں "ایک دن کا سلطان" کے مصداق ہوتی ہیں۔ مگر اس پر فرمائشی جہیز اور جوڑے گھوڑے کے اضافے نے اس نشہ کو دو آتشہ بنا دیا ہے اور اس پر ایک تو کریلا اور پھر نیم چڑھا والی کہاوت صادق آتی ہے۔

جہیز عصر جدید کی پیداوار

واقعہ یہ ہے کہ جہیز اور جوڑے گھوڑے کے غیر شرعی وغیر فطری وغیر عقلی رسم و رواج نے معاشرہ کی شکل و صورت بگاڑ کر رکھ دی ہے اور سماج کو ایک ایسے مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے جہاں سے اس کی خودکشی کی منزل بالکل قریب ہوگئی ہے اور اس غیر عقلی اور غیر فطری رسم و رواج نے آج ایک وبا کی شکل اختیار کر لی ہے اور ہندوستانی معاشرہ کشاں کشاں موت کی وادی کی طرف بڑھ رہا ہے۔

جہیز کی یہ وبا دور جدید کے "مہذب" معاشرہ کی دین ہے ورنہ موجودہ شکل میں پچھلے ادوار میں اس کا وجود نہیں تھا بلکہ آزادی ہند سے پہلے بھی اس کا رواج عام نہیں تھا۔

رسم صرف بعض شاہانہ اور امیر گھرانوں تک محدود تھی مگر رفتہ رفتہ اس کے اثرات دوسرے طبقوں پر بھی پڑتے گئے، جس کے باعث آج یہ شجر خبیثہ ایک تناور درخت کی سی شکل اختیار کر چکا ہے۔

چنانچہ ڈاکٹر اے ایس الٹیکر اپنی کتاب "ہندو تہذیب میں عورت کا مقام و مرتبہ" میں تحریر کرتا ہے۔

Dowry System, therefore was generally

unknown in early societies and the same was the case with ancient Hinuds, In rich and royal families some gifts used to be given to sons-in-law at the time of marriage.

The Postion Of Women In Hindu Civilization, By Dr. Altekar, P,70 Delhi, 1983

ترجمہ: اس لحاظ سے جہیز کا تصور ابتدائی معاشروں میں عام طور پر غیر معروف تھا اور۔ یہی حال قدیم ہندوؤں کا بھی تھا۔ امیر اور شاہی خاندان میں (البتہ) شادی کے موقع پر چند تحفے دامادوں کو دینے کا رواج تھا۔

جہیز نہیں مخالف جہیز قانون

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ جہیز کا رواج خود ہندو قانون کے اعتبار سے بھی ایک بدعت اور ایجاد بندہ ہے، جس کا ہندو شاستر میں کوئی وجود نہیں تھا بلکہ یہ بہت بعد کی پیداوار ہے۔ ہندو مذہب میں جہیز کا تصور کیسے پیدا ہوا؟ اس بات کو سمجھنے کے لئے چند حقائق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اس بحث سے یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ قدیم ہندو مذہب میں بجائے جہیز کے مخالف جہیز قانون رائج تھا۔

1-اس سلسلے میں سب سے پہلی حقیقت یہ ہے کہ قدیم ہندو قانون کی رو سے باپ، شوہر اور بیٹے وغیرہ کی وراثت میں عورت کا کوئی حصہ نہیں تھا جس طرح کہ اسلامی قانون میں موجود ہے۔ لہٰذا اسے شادی کے موقع پر زر زیور سے آراستہ کر کے داماد کے حوالے کیا جاتا تھا۔

2- مرد اور عورت جب ایک بار رشتہ نکاح میں بندھ جاتے تو اسے جنم جنم کا بندھن تصور کیا جاتا۔ طلاق یا خلع کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ لہٰذا لڑکی کا باپ اپنی لڑکی کو جو کچھ دینا چاہتا وہ نکاح کے موقع پر ہی دے دلا کر اسے رخصت کر دیتا۔ گویا کہ اس کے حق میں پوری طرح دست بردار ہو چکا ہے اور وہ اپنی لڑکی سے گویا کہ ہمیشہ کے لئے نجات پا چکا ہے۔

چنانچہ ہندو راج کے مطابق نکاح کے موقع پر "کنیا دان" کی جو رسم ادا کی جاتی ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ لڑکی کا باپ اپنی لڑکی کو بطور "ھبہ" داماد کے حوالے کر رہا ہے۔ یہ گویا کہ ایک اعلان ہے کہ اب اس کی لڑکی اس کے خاندان سے نکل کر اس کے داماد کے خاندان کا ایک جزو بن چکی ہے اور اب وہ کسی بھی صورت میں دوبارہ اپنے باپ کے خاندان میں واپس نہیں آسکتی اور نہ اس کا کوئی حق اس کے باپ یا بھائی پر عائد ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہندو عورت کو بیوہ ہونے کے بعد سوائے ستی ہونے یا گھٹ گھٹ کر مرنے یا بیسوائی کی زندگی گزارنے کے اور کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا۔

3- قدیم ہندو مذہب میں شادی کے آٹھ طریقے رائج تھے، جن میں سے صرف تین 1955ء تک (ہندو میرج ایکٹ کے نفاذ تک) جائز اور باضابطہ قرار دیئے جاتے تھے۔ ان کی مختصر تشریح اس طرح ہے۔

(الف) پہلا طریقہ "برھما" Brahma کہلاتا ہے، جس کا مطلب ہے لڑکی کا ھبہ The Gift Of A Daughter۔ چنانچہ "منو" کے مطابق لڑکی کو قیمتی زیورات سے آراستہ کر کے وید کے جاننے والے اور اچھے اخلاق والے شخص کو لڑکی بطور ہبہ پیش کرنا۔ یہ شکل دیگر طریقوں میں سب سے بہتر مانی گئی ہے اور اس شکل کے مطابق لڑکی کا باپ اپنی لڑکی دلماد کو بطور ہبہ پیش کرتا ہے۔ (اور اسی کا نام کنیادان ہے)

(ب) دوسرا طریقہ "گندھروا" GANDHARVA کہلاتا ہے۔ چنانچہ منو کے مطابق یہ کسی لڑکی اور اس کے عاشق کے برضا و رغبت ملاپ کا نام ہے۔ (جس کے مطابق دونوں میاں بیوی بن کر زندگی گزارنے لگتے ہیں)۔

(ج) تیسرا طریقہ "اسورا" ASURA کہلاتا ہے۔ اس طریقہ کے مطابق دولہا کو ایک دوشیزہ حاصل کرنے کے لئے لڑکی اور اس کے خونی رشتہ داروں کو کافی رقم دینی پڑتی ہے اور اس طریقے کے مطابق لڑکی کا باپ لڑکی حقیقتاً اپنے داماد کے ہاتھ فروخت کرتا ہے۔

(پارس دیوان کی انگریزی کتاب "ماڈرن ہندو لا" صفحہ 75 سے 76 مطبوعہ الہ آباد)

غرض ہندو مذہب اور قانون کی رو سے کسی ہندو عورت کا نکاح ایک ناقابل تنسیخ بندھن ہوتا ہے۔ یعنی وہ ایک مقدس اور جنم جنم کا بندھن ہوتا ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ ہندو

عورت کی شادی صرف ایک بار ہوتی ہے، جو طلاق اور خلع کے تصور سے نا آشنا ہوتی ہے۔ خواہ اس پر کتنے ہی ظلم و ستم کیوں نہ ہوں اور اس پر مصائب و آفات کا پہاڑ ہی کیوں نہ ٹوٹ پڑے وہ تو اف کر سکتی ہے اور نہ اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر سوچ سکتی ہے۔ اگرچہ ہندو میرج ایکٹ 1955ء کی رو سے اب عورت کو بعض حقوق ضرور دیئے گئے ہیں اور اسے طلاق حاصل کرنے کا حق بھی مل چکا ہے، مگر اس کے یہ تمام ترمیم شدہ حقوق کاغذی ہیں، جن کا عملی دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے۔

غرض مذکورہ بالا تین طریقے جو زمانہ قدیم سے رائج تھے ان میں فرمائشی جہیز اور جوڑے گھوڑے وغیرہ کا (جس کو بعض جگہ تلک اور بعض جگہ منگنی کہتے ہیں) کوئی تصور ہی نہیں ہے بلکہ یہ زمانہ حال کی پیداوار ہے۔ ڈاکٹر الٹیکر کی تحقیق کے مطابق ہندو قانون کی کتابیں (سمرتی وغیرہ) جہیز کے تذکرہ سے خالی ہیں جبکہ ان میں لڑکی کی قیمت لینے (مذکورہ بالا رواجوں کے مطابق "اسورا" طریقے میں) مذمت کی گئی ہے جبکہ دور قدیم میں لڑکیوں کو کچھ مال و متاع کے عوض میں نکاح کرنے کا رواج عام تھا۔ جیسا کہ وہ تحریر کرتا ہے کہ اس دور میں جہیز کا رواج لڑکی کے نکاح میں کوئی رکاوٹ نہیں تھا۔

The Dowry System did not stand as an impediment in daughter`s marriage in ancient India. In prehistoric times women were regarded as cattle and sdo it was the bride`s father, and not the bridegroom`s who was regarded as justified in demanding a payment at the time of marriage.

The Position Of Women In Hindu Civilization. P.69

ترجمہ: قدیم ہندوستان میں جہیز کا رواج لڑکی کی شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں بنتا تھا۔ ماقبل تاریخ ادوار میں عورتوں کی حیثیت اشیائے منقولہ کی طرح تصور کی جاتی تھی تو اس اعتبار

سے لڑکی کا باپ نہ کہ اس کا شوہر، نکاح کے وقت کچھ رقم کا مطالبہ کرنے میں حقدار مانا جاتا تھا۔

اس سے ثابت ہوا کہ دور قدیم میں خود ہندو قانون کی رو سے بھی جہیز اور وہ بھی فرمائشی جہیز وغیرہ لینے کا کوئی رواج یا تصور موجود نہیں تھا بلکہ اس کے برعکس لڑکی کا باپ اپنے داماد سے لڑکی کی قیمت وصول کرتا تھا۔ جس طرح کہ یہ رواج آج بھی پٹھانوں اور بعض عربوں میں پایا جاتا ہے۔ مگر اصل ہندو قانون کی رو سے یہ رواج ناجائز (غیر شرعی) تھا۔ اسی لئے سمرتیوں SMRITIS میں اس کی مذمت کی گئی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر الٹیکر تحریر کرتا ہے کہ چونکہ لڑکی کا باپ اپنے داماد سے نکاح کے وقت ایک معقول رقم کا مطالبہ کرتا تھا اس لئے سمرتی کے مصنفین نے اس رواج کی مذمت کی ہے اور اگر جہیز کا رواج بھی اس دور میں موجود ہوتا تو وہ اس کی بھی ضرورت مذمت کرتے۔ اسی وجہ سے سمرتیوں میں جہیز کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا کیونکہ اس وقت اس کا چلن ہی نہیں تھا۔

Ther are no references either in Smritis or in dramas to the dowry, i.e.to a pre-unptial contract of payment made by the bride`s father with the bridegroom his guardian, if the custon was previled to any thing like its present extent, it would have been vehemently condened by smriti writers like the counter custon of the bride-price. We meet with no such condemnation Ibid P.70

ترجمہ: سمرتیوں یا ڈراموں میں جہیز کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ یعنی شادی سے پہلے دولہا یا اس کے سرپرست کو بطور معاہدہ لڑکی کے باپ کا کچھ مال و متاع دینا اگر یہ رسم موجودہ رواج کی طرح اس وقت کسی بھی درجے میں موجود ہوتی تو سمرتیوں کے مصنفین اس کی پرزور طریقے سے مذمت کرتے جس طرح کہ انہوں نے دلہن کی قیمت لینے کی مذمت کی ہے جبکہ ہم کو ان میں اس قسم کی کوئی مذمت دکھائی نہیں دیتی۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ نکاح کے وقت لڑکی کے باپ یا اس کے سرپرستوں کا اپنے داماد سے اپنی لڑکی دینے کے عوض میں کچھ رقم کا مطالبہ کرنا یا کسی درجے میں اس کی "قیمت" لینا جس طرح ہندو مذہب میں ناجائز اور خلاف شرع تصور کیا گیا ہے اسی طرح خود جہیز کا مطالبہ (جو داماد کی جانب سے سسر سے کیا جائے) بدرجہ اولیٰ ناجائز اور خلاف شرع قرار پاسکتا ہے کیونکہ یہ چیز خلاف عقل اور خلاف فطرت ہے۔ چنانچہ سمرتیوں کے مصنفین نے "لڑکی کی قیمت" لینے کو جس طرح ناجائز اور خلاف شرع بتایا ہے اسی طرح "لڑکے کی قیمت" یعنی فرمائشی جہیز کی اور زیادہ مذمت نکل سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب لڑکی کے باپ کو اپنے داماد کی جانب سے کچھ "معاوضہ" لینے کا کوئی حق نہیں ہے تو پھر اس قسم کا حق داماد کو کس طرح حاصل ہوسکتا ہے کہ وہ لڑکی کے باپ سے اپنے لئے جوڑے گھوڑے یا ملک وغیرہ کا مطالبہ کرے؟ اس قسم کا مطالبہ سراسر ناجائز اور خلاف عقل ہے۔

واضح رہے کہ سمرتیوں کے مصنفین نے جس طرح لڑکی کی قیمت (وہ رقم جو لڑکی کی رخصتی کے وقت لڑکی کا باپ اس کا کوئی سرپرست حاصل کرتا ہے) لینے کی مذمت کی ہے بالکل اسی طرح اسلامی قانون میں بھی اس کی مذمت وارد ہوئی ہے کیونکہ بعض پٹھانوں اور عربوں میں اس کا رواج پایا جاتا ہے۔ چنانچہ فقہ حنفی کی مستند کتاب فتاویٰ شامیہ (ردالمختار) میں مذکور ہے۔

وَمِنَ السُّحْتِ مَا يَأْخُذُهُ الصِّهْرُ مِنَ الْخَتَنِ بِسَبَبِ بِنْتِهِ بِطِيْبِ نَفْسِهِ حَتّٰى لَوْ كَانَ بِطَلَبِهِ يَرْجِعُ الْخَتَنُ بِهِ :سسر اپنے داماد سے اپنی لڑکی کی وجہ سے جو مال لیتا ہے وہ بھی حرام میں شامل ہے۔ خواہ داماد یہ مال اپنی خوشی سے دے۔ ورنہ اگر سسر کے مطالبہ پر دے گا تو داماد کو وہ مال لوٹا لینے کا حق حاصل ہوگا۔ (فتاویٰ شامیہ ابن عابدین شامی جلد پنجم صفحہ 301)

اور فقہ حنفی کی ایک اور مستند کتاب فتاویٰ عالمگیری میں مرقوم ہے۔

وَلَوْ أَخَذَ أَهْلُ الْمَرْأَةِ شَيْئًا عِنْدَ التَّسْلِيْمِ فَلِلزَّوْجِ أَنْ يَسْتَرِدَّهُ لِأَنَّهُ رِشْوَةٌ" كَذَا فِي الْبَحْرِ الرَّائِقِ: اور اگر رخصتی کے وقت لڑکی والے کچھ مال لیں تو خاوند کو حق حاصل ہے وہ اس مال کو واپس لے لے کیونکہ یہ چیز رشوت کے حکم میں

ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری جلد اول صفحہ 327)

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ جہیز کے تصورات کے باب میں اصل ہندو قانون اور اسلامی قانون میں بہت بڑی حد تک مشابہت نظر آتی ہے۔ چنانچہ ان دونوں میں جہیز کا کوئی واضح تصور موجود نہیں ہے اور جو "جہیز مخالف قانون" یعنی "لڑکی کا معاوضہ" لینے کا رواج موجود تھا اس کی مذمت ہندو قانون اور اسلامی قانون دونوں میں کی گئی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جب عقلی اعتبار سے لڑکی کا معاوضہ لینا جائز نہیں ہے تو پھر لڑکے کا معاوضہ لینا یا اس کو "نیلامی مارکٹ" میں فروخت کرنا بھی جائز نہیں ہے کیونکہ نکاح کے بعد لڑکی لڑکے کا گھر بسانے جاتی ہے اور اس کی "قیدی" یا "داسی" بن کر زندگی گزارتی ہے۔ یہ نہیں کہ لڑکی کا گھر بسانے کے لئے آتا ہو۔ لہٰذا قانون فطرت کے مطابق اگر معاوضہ لینا جائز ہوتا تو لڑکی کے باپ کے لئے اس کی گنجائش نکل سکتی تھی نہ کہ لڑکے کے لئے لہٰذا فرمائشی جہیز یا جوڑے گھوڑے کا مطالبہ ایک خلاف عقل اور غیر منطقی مطالبہ ہے جو تمدن و معاشرت میں بگاڑ پیدا کرنے والا ہے۔

جہیز کا تصور کیسے پیدا ہوا؟

اب سوال کی طرف آئیے کہ جب اصل ہندو قانون میں جہیز جائز یا شروع نہیں تھا تو پھر اس کا تصور اور رواج کس طرح ہوا؟ تو اس سوال کا حل تلاش کرنے کے لئے ہمیں پھر سے ہندو مذہب میں رائج نکاح کے طریقوں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ چنانچہ اوپر نکاح یا شادی بیاہ کے تین طریقے مذکورہ ہیں جو ہندو مذہب میں دور قدیم سے رائج رہے ہیں۔ چنانچہ منو کے قانون کے مطابق تیسرا طریقہ "اسورا" کہلاتا ہے جس کے مطابق لڑکی کا باپ اپنی لڑکی داماد کے ہاتھوں فروخت کردیتا ہے چونکہ اس میں انسانیت کی توہین و تذلیل کا پہلو نظر آتا ہے اس لئے سمرتیوں میں اس کو ناجائز اور مذموم قرار دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس پہلے طریقے "برہما" کو افضل ترین طریقہ قرار دیا گیا ہے جس میں اصلاً لڑکی کے ہبہ کا تصور پایا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ لڑکی چونکہ ایک خاندان سے نکل کر دوسرے خاندان کا جزو لاینفک بننے جارہی ہے (اس طرح کہ اب اس کے خونی رشتہ داروں کے ساتھ اس کو

کوئی قانونی تعلق باقی نہیں رہا) اس لئے اسے اس سے اپنے خاندان سے رخصتی (یا اخراج) کے وقت اس کا دل خوش کرنے کی غرض سے چند چیزیں بطور تالیف قلب اسے دے دی جائیں تا کہ اس کی وحشت میں کسی قدر کمی ہو سکے۔ چنانچہ سمرتیوں نے بھی لڑکی کے باپ کے لئے حسب حیثیت لڑکی کے لئے زیورات کی فراہمی کی سفارش کی ہے۔ تاہم شادی سے پہلے کس قسم کے مطالبے یا تقاضے کا اس سلسلے میں کوئی جواز نہیں تھا۔

Smcitis, no doubt, recommend that the bride as old be given in marriage along with suitable ocnaments, but their number and price is left entirely to the discertion and ability of the bride`s father. A prenuptial contract in ths respect is neither contemplated nor countenced.

اور بقول ڈاکٹر موصوف (ہندو معاشرے میں) جہیز کا رواج نکاح کے تصور میں بطور ایک تحفہ DANA مربوط ہو گیا (تا کہ لڑکی کی تالیف قلب ہو سکے) اور یہ تحفہ نقدی یا سونے کی شکل میں ہوا کرتا تھا۔ جو برائے نام (معمولی قسم کا) ہوتا اور نکاح کے انعقاد میں کوئی رکاوٹ نہیں بنتا تھا۔ اگر ایک معاشرتی برائی کے حیثیت سے اس کا عروج تیرہویں اور چودہویں صدی عیسوی میں راجپوتانہ میں ہوا اور انیسویں صدی کے وسط میں اس رواج نے ایک اہانت آمیز شکل اختیار کر لی ہے اور گزشتہ پچاس ساٹھ سال کے دوران جہیز ایک نفع بخش کاروبار کا روپ دھار چکا ہے اور شادی کے بازار میں داماد کے دام بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ جہیز کا رواج انگریزوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد بہت بڑھ گیا ہے کیونکہ اس سے پہلے اس ملک کا انحصار زیادہ تر زراعت پر تھا اور حکومتوں کے مناسب (اور اسی طرح صنعتی ترقی نہ ہونے کے باعث) دولت کی ریل پیل نہ تھی۔ لہٰذا اس وقت کی صورت حال موجودہ دور سے مختلف تھی۔ (دی پوزیشن آف ویمن ان ہندو سویلیزیشن صفحہ 70 سے 71)

جہیز تہذیب جدید کا تحفہ

یہ ہے ہندو قانون اور ہندو سماج میں جہیز کے تصور اور اس کے رواج کا ایک سرسری جائزہ اور اس کی صحیح حال۔ واقعہ یہ ہے کہ پچھلے "غیر مہذب" ادوار میں جہیز کی وبا اتنی عام اور شدید نہیں تھی جتنا کہ موجودہ "مہذب" دور میں نظر آ رہی ہے۔ چنانچہ تعلیم و تہذیب کا چرچا جس قدر عام ہو رہا ہے اسی قدر شادی کے مارکیٹ میں دولہا کی قیمت بڑھتی جا رہی ہے۔ جس کی ڈگری جتنی اونچی ہوگی اسی قدر اس کے دام میں اضافہ نظر آئے گا۔ چنانچہ ہندوستان کے بعض علاقوں میں تعلیمی ڈگریوں کے اعتبار سے دولہا کے دام مقرر کئے جاتے ہیں۔ کوئی انڈر گریجویٹ ہے تو پچیس ہزار روپے گریجویٹ ہے تو لاکھ دو لاکھ اور اگر ڈاکٹر یا انجینئر ہے تو پانچ سات لاکھ۔

اور شادی کے اس مارکیٹ میں نیلام ہونا اب ہندوؤں کی کوئی تخصیص نہیں رہی بلکہ اس میدان میں اب مسلمان بھی پیش پیش دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ اخبار انڈین ایکسپریس کی ایک رپورٹ کے مطابق بہار، آندھرا اور کیرالا میں تلک اور گھوڑے کا جوڑا کے نام سے یہ مذموم طریقہ رائج ہے۔ یوپی اور مدھیہ پردیش میں یہ رسم "سلام کرائی" کے نام سے متعارف ہے جو نکاح کے موقع پر دولہا یا اس کے رشتہ دار کو نقدی کی شکل میں دی جاتی ہے۔ اسی طرح بمبئی، دہلی اور کلکتہ میں پڑھے لکھے مردوں کا تناسب لڑکیوں کے مقابلے میں کم ہونے کے باوجود لڑکوں کی مانگ زیادہ رہتی ہے۔ (انڈین ایکسپریس 11 جولائی 1987ء)

کیونکہ ان صنعتی شہروں میں لڑکوں کو اپنا آبائی کاروبار سنبھالنے کے لئے زیادہ تعلیم کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس وجہ سے ان شہروں میں لڑکیاں لڑکوں کے مقابلے میں زیادہ تعلیم یافتہ ہوتی ہیں کیونکہ لڑکیوں کو اس کے مواقع زیادہ حاصل رہتے ہیں۔

بہر حال آزادی ہند کے بعد جہیز کے رسم و رواج اور اس کے طور طریقوں میں بے انتہا اضافہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ حکومت ہند نے 1961ء میں جہیز طلب کرنے یا دینے والے کو چھ ماہ کی قید اور پانچ ہزار روپوں تک جرمانہ کا سزاوار قرار دیا گیا تھا۔ مگر اس کے باوجود جہیز کا رواج بے تحاشہ بڑھ رہا ہے اور اسے ختم کرنے کے لئے جتنے بھی طریقے سوچے جا رہے ہے

ہیں وہ مزید پھل اور پھول رہا ہے۔ اس کی وجہ معاشرہ کا لالچی اور حریص بن جانا اور پرائے مال پر نظر بد ڈالنا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ ''مہذب'' انسان کا سینہ ایمان و یقین اور خوف خدا سے عاری ہو چکا ہے اور اس کی جگہ حرص و آز اور دنیائے فانی کی محبت نے لے لی ہے۔ گویا کہ اس کا سینہ علم و عرفان کے نور سے منور ہونے کے بجائے فانی چیزوں کی محبت میں تاریک اور سیہ کار بن چکا ہے اور وہ بجائے مہذب اور شائستہ بننے کے دور وحشت کی طرف بے تحاشہ بھاگ رہا ہے۔ گویا کہ اپنے ہی آشیانے کو اپنے ہاتھوں برباد کر دینا چاہتا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ افسوس مسلمانوں کے حال زار پر ہوتا ہے، جو ایک زندہ مذہب اور زندہ شریعت کے مالک ہیں۔ ایسا مذہب جو تمام مذاہب عالم میں یکتا و منفرد ہے اور ایسی شریعت جو تمام شریعتوں میں سب سے زیادہ جامع اور معقول و متوازن ہے۔ وہ کامل اور برتر شریعت جو پوری نوع انسانی کے لئے باعث رحمت اور نجات دہندہ ہے۔ مگر اس کامل اور برتر شریعت کو چھوڑ کر دوسری قوموں اور ملتوں کے رسم و رواج اور ان کے غیر معقول قوانین کی طرف لپکنا نہ صرف اسلام جیسی نعمت عظمیٰ (وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي) (سورۃ مائدہ 5، آیت 3) کا انکار ہے بلکہ ایک جاہلی قانون کو گلے لگا کر اپنی عاقبت خراب کرنا اور اللہ قدوس کے غضب کا مستحق بننا ہے۔ لہٰذا اس جاہلی قانون سے اہل اسلام کا اجتناب ضروری ہے۔

جہیز کی ہولناکی و تباہ کاری

فرمائشی جہیز اور جوڑے گھوڑے کے غلط اور غیر معقول رسم و رواج نے آج معاشرے کے نام میں دم کر رکھا ہے۔ حریصانہ فرمائشوں کا ایسا چکر چل رہا ہے جس کو کوئی بھی مذہب اور کوئی بھی قانون جائز اور معقول قرار نہیں دے سکتا۔ صرف نکاح سے پہلے اور نکاح کے وقت ہی نہیں بلکہ نکاح کے بعد بھی شیطانی مطالبات کا ایک چکر چلنا شروع ہو گیا ہے، جن کا سابقہ ادوار میں کوئی تصور تک نہیں تھا اور یہ چیز تمام تر عصر جدید کی پیداوار ہے جو قابل مذمت ہے اور ایسے حریص لوگ انسانیت کے دشمن ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قبیح اور مذموم رواج کے باعث ہر سال ہزاروں عورتیں جہیز کے منحوس دیوتا کی بھینٹ چڑھائی جا رہی ہیں

اور معاشرہ اس خوفناک مرض میں مبتلا ہو کر ایک بخار زدہ شخص کی طرح پھنک رہا ہے بلکہ اس کی آگ میں جل کر بھسم ہو رہا ہے اور یہ جنگل کی آگ کی طرح پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔

ایک رپورٹ کے مطابق 1975ء میں صرف دہلی شہر میں ساڑھے تین سو دلہنیں زندہ جلا کر یا گلا گھونٹ کر یا پھانسی دے کر موت کے گھاٹ اتاری گئیں۔ جون 1980ء سے 1985ء تک مہاراشٹر کے صرف ایک علاقے ودابھ میں دو سو عورتیں اسی طرح قتل کر دی گئیں۔ لکھنؤ میں ہر پانچ دن میں ایک نئی نویلی دلہن جہیز کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے اور ریاست اتر پردیش میں ہر دن پانچ عورتیں موت کے منہ میں دھکیل دی جاتی ہیں۔

ایک تازہ رپورٹ کے مطابق گزشتہ چالیس سال کے عرصہ میں 72 ہزار سے زیادہ نوخیز دلہنوں کو ہندوستان میں جلایا جا چکا ہے۔ (روزنامہ دکن ہیرالڈ بنگلور 3 جنوری 1989ء)

یہ اعداد و شمار وہ ہیں جو پولیس کے ریکارڈ میں موجود ہیں۔ ورنہ ایسی بہت سی اموات ہو سکتی ہیں جو پولیس یا سرکاری اعداد و شمار کے دائرہ سے باہر ہوں۔ اس اعتبار سے جہیز کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھائی جانے والی معصوم لڑکیوں کی صحیح تعداد کا علم لگانا نہایت مشکل ہے۔ وہ لاکھوں میں ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ جہیز کے عذاب میں پھنس کر جن عورتوں کی زندگی موت سے بدتر ہو چکی ہے ان کی تعداد بھی لاکھوں تک ہو سکتی ہے۔ یعنی وہ عورتیں جو آئے دن کے مطالبات سے تنگ آ کر نہایت ناخوشگوار حالات اور مرحلوں سے گزر رہی ہوں اور جن کو زندگی گزارنا حرام ہو گیا ہے۔ ایسی عورتیں نہ تو اپنے شوہروں اور سسرال والوں کے بے جا مطالبات پورے کر سکتی ہیں اور نہ اپنے غریب ماں باپ کو ان ناجائز مطالبات کی تکمیل پر مجبور کر کے ان کی بے کسی اور بے بسی میں اضافہ کرنے کی روادار ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا وہ یا تو گھٹ گھٹ کر مرنا پسند کرتی ہیں یا اس جنجال سے ہمیشہ کے لئے نجات پانے کی غرض سے اپنے گلے میں پھندا ڈال کر، یا زہر کھا کر خودسوزی کر کے اس عذاب سے نکل جانا چاہتی ہیں۔ اس طرح ہر دن اور ہر آن نوخیز دلہنوں کی خودکشیوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔

باضمیر لوگوں کے لئے ایک لمحہ فکریہ

خودکشی شریعت کی رو سے حرام ہے۔ مگر اس فعل حرام پر اکسانے والا وہ ظالم معاشرہ ہے جو انتہائی حریص اور لالچی بن کر انسانیت کے قتل عام پر تلا ہوا ہے۔ غرض آپ علمی، عقلی اور شرعی کسی بھی حیثیت سے غور فرمایئے جہیز کی رسم آپ کو انتہائی قبیح، مذموم اور بھیانک معلوم ہوگی اور اس سے اجتناب کرنا انسانیت کے بہی خواہوں اور خاص کر اسلام کے نام لیواؤں کے لئے ضروری ہے جو انسانیت کے نجات دہندہ ہیں۔ یہ باضمیر لوگوں کے لئے ایک لمحہ فکریہ ہے۔ لہٰذا جن لوگوں کا ضمیر ابھی مردہ نہیں ہوا وہ ذرا سوچیں کہ دین واخلاق کے تقاضوں کو فراموش کر کے اور اپنے ضمیر کی آواز کو دبا کر وہ کدھر جا رہے ہیں؟ اور ان کا قبلہ و کعبہ کدھر ہے؟ کیا انہیں دین واخلاق اور ملک وملت کا مفاد عزیز ہے یا چند سکے زیادہ عزیز ہیں، جن کی جھنکار پر وہ اپنا دین وایمان اور ضمیر تک کا سودا کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں؟ مگر مجھے یقین نہیں آتا کہ جس کے دل میں اللہ کا خوف کسی بھی درجے میں موجود ہو یا جس کے قلب میں دین وایمان کا شائبہ بھی پایا جاتا ہو وہ اتنی آسانی کے ساتھ بھرے بازار میں خود کو فروخت کرنے بلکہ بذریعہ نیلام اپنی بولی آپ لگانے کے لئے تیار ہو سکتا ہو!

حقوق العباد کی اہمیت

بہر حال کسی کے دین وایمان اور اس کے اخلاق وکردار کو جانچنے کی یہ ایک کسوٹی ہے۔ اگر کسی نے نادانی یا انجانے پن میں ایسی کوئی حرکت کردی ہے تو وہ قابل معافی ہو سکتی ہے۔ مگر جان بوجھ کر یا اتمام حجت ہو جانے کے بعد بھی اس قبیح اور قابل ملامت رسم پر اصرار کرنا ایک بدترین قسم کا سماجی واخلاقی گناہ اور قانون جاہلیت کی پیروی ہے اور یہ چیز حقوق العباد کے ذیل میں آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے حقوق کو معاف کر سکتا ہے (یعنی وہ حقوق جو عبادت سے متعلق ہیں) مگر وہ حقوق العباد کو معاف نہیں کرتا۔ چنانچہ قیامت کے دن ظالم لوگوں سے مظلوموں کا حق دلایا جائے گا۔ اگر کسی نے کسی کا مال ناحق کھایا ہے، یا کسی کو ستایا ہے یا کسی پر تہمت لگائی ہے یا کسی کو گالی دی ہے تو ایسے ظالم شخص کی نیکیاں چھین کر مظلوم کے

حوالے کی جائیں گی۔ جیسا کہ ایک صحیح حدیث میں مذکور ہے۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے کہ ''تم قیامت کے دن حقداروں کو ان کے حقوق ضرور ادا کرو گے۔ بے سینگ والی بکری کو بھی سینگ والی بکری سے اس کا حق دلایا جائے گا۔ (صحیح مسلم کتاب البر والصلہ)

اس اعتبار سے اگر دنیا میں کسی نے کسی کی حق تلفی کی ہے اور کسی کو ناحق ستایا ہے یا اس پر کسی بھی قسم کا ظلم کیا ہے تو قیامت کے دن اس کو چکانا پڑے گا، جو سب سے زیادہ ہولناک دن ہوگا۔

جہیز ایک سماجی ظلم

خلاصہ بحث یہ کہ اسلام میں جن باتوں کا حکم دیا گیا ہے انہیں ہر حال میں ادا کرنا چاہئے اور جن باتوں سے منع کیا گیا ہے ان سے ہر حال میں اجتناب ضروری ہے۔ اس اعتبار سے حلال اور حرام بالکل واضح ہیں۔ ان کے علاوہ مشتبہ امور ہوتے ہیں جن سے بچنا ضروری ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک جامع قاعدہ وہ ہے جسے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے اس طرح بیان کیا ہے۔

فَاِنَّ الْحَلَالَ بَیِّنٌ وَ الْحَرَامَ بَیِّنٌ وَ بَیْنَ ذٰلِکَ اُمُوْرٌ مُشْتَبِهَةٌ فَدَعْ مَایُرِیْبُکَ اِلٰی مَالَایُرِیْبُکَ (اسلامی شریعت میں) حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان بعض مشتبہ چیزیں ہیں۔ تو تم مشکوک چیزوں کو ترک کر کے غیر مشکوک چیزوں کو اختیار کرو۔ (سنن دارمی جلد اول صفحہ 61)

یہ شریعت کا ایک عام ضابطہ اور قاعدہ کلیہ ہے۔ اللہ اور اس کے رسول نے اہل اسلام کے لئے جن باتوں کو ضروری سمجھا ان کو پوری وضاحت کے ساتھ قرآن اور حدیث میں بیان کر دیا گیا ہے اور ان کی مزید تشریح وتوضیح فقہانے کر دی ہے۔ مگر جہیز کی رسم اور اس کے رواج کو شریعت اسلامی نے غیر ضروری بلکہ مفسد تمدن تصور کر کے بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ چنانچہ قرآن، حدیث اور فقہ سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اگر شریعت میں اس کی ذرا سی بھی اہمیت ہوتی تو اسے نظر انداز نہ کیا جاتا جبکہ نکاح اور معاشرتی زندگی سے متعلق چھوٹے سے چھوٹے جزئیات تک کا تذکرہ اسلامی شریعت میں ملتا ہے۔ لہٰذا یہ سراسر ایک غیر اسلامی

بلکہ جاہلی تصور ہے جو ایک سماجی ظلم اور زیادتی ہے۔ اسلام ہر قسم کے سماجی ظلم اور زیادتی کو مٹانے اور غلط رسوم ورواجات کو نیست ونابود کرنے کے لئے دنیا میں آیا ہے۔ لہٰذا وہ اس سماجی ظلم کی حمایت کس طرح کرسکتا ہے۔

اسلامی شریعت کا معجزہ اور غیر معقول قوانین کا ابطال

جہیز کی حرمت قرآن میں

قرآن حکیم میں اگر چہ جہیز کا تذکرہ لفظی اعتبار سے موجود نہیں ہے۔ مگر اصولی اور معنوی اعتبار سے اس کا تذکرہ قرآن کے ابدی کلیات میں ضرور موجود ہے کیونکہ قرآن حکیم ایک ایسا حیرت انگیز کلام ہے جس میں ہر چیز کا تذکرہ کسی نہ کسی انداز میں ضرور موجود ہے جو تلاش کرنے پر ضرور مل سکتا ہے۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ :اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے ہر طرح کی مثال بیان کردی ہے تا کہ وہ متنبہ ہوسکیں (سورۃ زمر 39، آیت 27)

غرض بعض آیات میں اصولی اور کلی طور پر لوگوں کو ایک دوسرے کا مال ناحق کھانے کی جو ممانعت کی گئی ہے ان میں جہیز اور جوڑے گھوڑے کے مطالبات بھی بآسانی شامل ہوسکتے ہیں کیونکہ وہ ناحق (بلا معاوضہ) ہیں اور شریعت میں بلا معاوضہ کوئی حق ثابت نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس اصول کی وضاحت قرآن حکیم میں دو موقعوں پر اس طرح کی گئی ہے۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (سورۃ بقرہ 2، آیت 188) اور تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور ان سے متعلق قضیہ جات کو لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ (جھوٹی گواہی وغیرہ) کے ذریعے جان بوجھ کر ہڑپ کرنے کی غرض سے حکام وقت تک مت پہنچاؤ۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ

تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا (سورۃ نساء 4، آیت 29) اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ مگر یہ کہ باہمی رضامندی سے کوئی تجارت ہو اور اپنے آپ کو قتل مت کرو (کیونکہ) اللہ تم پر بہت مہربان ہے۔ (لہٰذا وہ تمہاری ہلاکت نہیں چاہتا)

ان دونوں آیتوں میں مال باطل کی جتنی بھی شکلیں ہوسکتی ہیں وہ سب شریعت کی نظر میں ممنوع اور حرام ہیں اور ان میں جوڑے جہیز کا مطالبہ بھی شامل ہوسکتا ہے۔ لہٰذا مختلف مفسرین نے ان آیات کی جو تفسیر کی ہے ان میں سے بعض نکات اس موقع پر پیش کئے جاتے ہیں تا کہ "مال باطل" کا مفہوم پوری طرح واضح ہوجائے۔

1- باطل سے مراد ہے بغیر کسی حق کے۔ (تفسیر قرطبی ابوعبداللہ محمد انصاری قرطبی جلد پنجم صفحہ 150)

یعنی اس طور پر کہ اسے اللہ نے حلال ومشروع قرار نہ دیا ہو۔ (تفسیر کشاف علامہ جار اللہ رضی شری جلد اول صفحہ 340)

باطل وہ ہے جو شرعاً حرام ہو، جیسے چوری اور غصب وغیرہ۔ (تفسیر جلالین جلد اول صفحہ 27)

2- بغیر کسی حق (یا عوض کے) اس میں ایک دوسرے کا مال کھانے کی ممانعت آئی ہے اور اس میں قمار (جوا) دھوکہ دہی، غصب (کسی کا مال زبردستی اینٹھ لینا) حقوق (واجبہ) کا انکار، وہ مال جسے مالک مال خوش دلی سے نہ دے رہا ہو اور وہ مال جسے شریعت نے حرام قرار دیا ہو اگر چہ مالک مال اسے خوش دلی ہی سے دے رہا ہو، جیسے رنڈی کا معاوضہ، جوتشی کی اجرت اور شراب وخنزیر کی قیمتیں وغیرہ سب داخل ہیں۔ (تفسیر قرطبی جلد دوم صفحہ 338)

3- (اس سلسلے میں ایک قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ) جس شخص نے کسی دوسرے کا مال شریعت کی اجازت کے بغیر لیا وہ مال باطل کھانے کا مرتکب ہوگیا اور مال باطل کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ کوئی شخص قاضی سے (یا کسی عدالت سے) اپنے حق میں (ناحق) فیصلہ کرالے جب کہ وہ اچھی طرح جانتا ہو کہ وہ باطل پر ہے تو قاضی کے فیصلے سے حرام چیز اس کے لئے حلال نہیں ہوجاتی کیونکہ قاضی (یا کوئی بھی عدالت) محض ظاہری (ثبوت وشہادت) کے

مطابق فیصلہ کرے گی۔ (تفسیر قرطبی جلد دوم صفحہ 238)

4۔ بخاری و مسلم کی ایک حدیث کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید الاضحیٰ کے موقع پر لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

فَاِنَّ دِمَاءَ كُمْ وَ اَمْوَالَكُمْ وَ اَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَام" كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا :تم پر آپس میں ایک دوسرے کا خون، ایک دوسرے کا مال اور ایک دوسرے کی آبرو اسی طرح حرام ہے، جس طرح کہ آج کے دن کی حرمت (صحیح بخاری کتاب الحج جلد دوم صفحہ 191 صحیح مسلم کتاب الحج جلد دوم صفحہ 889)

5۔ امام قرطبی نے سورۃ نساء کی مذکورہ بالا آیت میں مال باطل سے تجارت کو مستثنیٰ قرار دیئے جانے کے سلسلے میں ایک بہترین قاعدہ اور اصول بیان کیا ہے جو یہ ہے۔

جان لو کہ ہر معاوضہ تجارت ہے خواہ عوض جس طرح بھی طے پائے۔ مگر اس موقع پر "باطل" کہنے کی بنا پر ہر وہ عوض خارج ہو گیا جو شرعاً معاوضہ بن سکتا ہو، جیسے سود یا عوض فاسد جیسے شراب اور خنزیر وغیرہ۔ اس قید (باطل کی) سے وہ جائز معاملہ بھی خارج ہو گیا جس میں عوض (فوری) پایا نہیں جاتا جیسے قرض، صدقہ اور ہبہ جو ثواب کی غرض سے نہ ہو اور دوسرے دلائل کی بنا پر بغیر سوال کے یا بغیر وجوب کے (تبرعاً) کچھ دے دینا بھی جائز ہے۔ یہ (باطل کے) دوسرے ہیں جن پر سب کا اتفاق ہے۔ (تفسیر قرطبی جلد پنجم صفحہ 152) (دوسروں کا مطلب ہے دو کنارے یا دو بازو، جن کی وجہ سے باطل کے حدود و ضوابط کے تعین میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس اعتبار سے جوڑا جہیز شریعت کی نظر میں حرام ہے کیونکہ وہ بغیر کسی عوض یا معاوضے کے ہونے کی بنا پر اس پر "مال باطل" کا مفہوم پوری طرح صادق آتا ہے اور پھر وہ زبردستی وصول کیا جاتا ہے اگر لڑکی کے ماں باپ ہنسی خوشی بھی اگر کچھ دیتے ہیں تو اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ (1) وہ اشیا جو وہ اپنی لڑکی کو بغیر کسی مطالبے کے اپنی خوشی سے دے رہے ہیں۔ اس کا جواز نکل سکتا ہے۔ (2) وہ روپیہ پیسہ جو وہ دولہا کو جوڑے یا تلک یا سلامی وغیرہ کے نام سے دے رہے ہوں، خواہ یہ چیز مطالبہ پر دی جائے یا بغیر کسی مطالبے کے، دونوں صورتوں میں وہ "مال باطل" ہے اور بغیر مطالبے کے دی جائے تو وہ رشوت ہے جو حرام ہے

جس طرح لڑکی کا باپ اگر نکاح کے وقت اپنی لڑکی کا کچھ معاوضہ طلب کرتا ہے تو وہ رشوت کے حکم میں ہے خواہ دولہا اسے خوشی سے دے یا ناخوشی سے۔ (جیسا کہ تفصیل پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے) اسی طرح دولہا کا دلہن کے باپ کی طرف سے کوئی چیز لینا بھی رشوت کے حکم میں آ سکتا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں شریعت کی پابندی اور تقویٰ کا تقاضا ہے کہ ایک سچا مسلمان اس قسم کی مشتبہ اور مشکوک چیزوں سے ہر حالت میں بچنے کی کوشش کرے۔

اس موقع پر آیت ثانی میں وَلَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ (اپنے آپ کو قتل مت کرو) کا فقرہ بہت ہی بلیغ اور معنی خیز ہے۔ مفسرین نے اگرچہ اس کے متعدد معانی بیان کئے ہیں مگر "اکل باطل" کا ایک فکر انگیز مفہوم وہ ہے جو مولانا احمد علی لاہوری نے اپنے ترجمہ قرآن کے حواشی میں تحریر کیا ہے۔

"باہمی رضامندی سے لین دین کرنا ہی حقیقتاً تجارت ہے۔ اس کے علاوہ ہر شخص کے لئے دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ کسی کی رضامندی کے بغیر اس کا مال ہضم کر لیا جائے۔ دوسرا یہ کہ لین دین کا مسئلہ ہی بند کر دیا جائے۔ معاملات میں جبر و کراہ کا دروازہ کھولنا بھی موجب ہلاکت ہے۔ لہٰذا اسے قتل نفس کہنا بالکل بجا ہے اور قوم سے لین دین کے تعلقات منقطع کر لینا بھی قتل نفس کے برابر ہے۔ اس لئے کہ اس طرح قوم کی ترقی بالکل رک جاتی ہے۔" (خفیف سی ترمیم کے ساتھ)

اس لحاظ سے یہاں پر قتل کے مجازی معنی مراد ہیں۔ مگر یہ قرآنی آیت کا واحد مفہوم نہیں ہے۔ کیونکہ قرآنی آیات میں وسیع اور کلی مفہوم مقصود ہوتا ہے۔ بہر حال یہاں پر مقصود ہر قسم کے باطل معاملات کا ابطال ہے جن کی رو سے کسی بھی قسم کا معاشرتی فساد اور تمدنی بگاڑ پیدا ہو سکتا ہو اور موجودہ دور میں جوڑے جہیز کا معاملہ ایسا ہی ایک مذموم اور تباہ کن معاملہ ہے جو فساد تمدن اور فساد معاشرت کا سبب اور اس کی واضح علامت بن چکا ہے۔ یہ ہزاروں جانیں لے چکا ہے اور ہزاروں بلکہ لاکھوں کی زندگی کو مبتلائے عذاب بنائے ہوئے ہے۔ گویا کہ اس ہولناک رواج کی وجہ سے معاشرہ کا قتل عام ہو رہا ہے۔ لہٰذا "اپنے آپ کو قتل کرو۔" ایک بلیغ ترین ربانی فقرہ اور ایک زندہ حقیقت ہے جو عصر حاضر کے لئے ایک پیام حیات اور صوت سرمدی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ اپنے آپ کو اپنے بندوں

کے لئے مشفق ومہربان کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، جیسا کہ مذکورہ بالا آیت کے آخر میں ارشاد باری ہے غرض اس اعتبار سے فرمائشی جوڑے جہیز کا رواج وقانون مال باطل کی قبیل سے ہونے کی بناپر خلاف شریعت اور حرام ہے، جو قاتل انسانیت ہے۔

حلال وحرام کا ایک ضابطہ

امام رازی نے سورۂ بقرہ کی مذکورۂ بالا آیت کی تفسیر میں احیاء العلوم مؤلفہ امام غزالی کے حوالہ سے ایک فکر انگیز تفسیر بیان کی ہے جو اسلامی شریعت میں حلال اور حرام کی صحیح معرفت اور اس کے حدود وضوابط کے سلسلے میں ایک کلی قاعدہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ لہٰذا اس موقع پر اس کا ایک خلاصہ بیان کیا جاتا ہے۔

مال یا تو معدنیات کی قسم سے ہوگا، یا نباتات کی قسم سے یا حیوانات کی قسم سے۔ تو معدنیات میں وہ چیزیں حرام ہوسکتی ہیں جو مسموم ہوں۔ نباتات میں بعض چیزیں زندگی کے لئے مضر، بعض چیزیں صحت کے لئے مضر اور بعض چیزیں عقل کے لئے نقصان دہ ہوسکتی ہیں، جیسے شراب، بھنگ اور منشیات، حیوانات میں بعض کھائے جاتے ہیں اور بعض نہیں کھائے جاتے اور جو جانور حلال ہیں وہ بھی صرف شرعی طور پر ذبح کئے جانے کے بعد ہی حلال ہوسکتے ہیں۔ مگر ذبح کئے ہوئے جانور کے تمام اجزاء بھی حلال نہیں ہوتے بلکہ گوبر اور خون حرام ہیں۔ ان باتوں کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں مذکورہ ہے۔

یہ تقسیم فطری وقدرتی ہونے کی حیثیت سے ہے۔ ایک دوسری تقسیم اکتسابی یا شرعی اعتبار سے ہے۔ یعنی قسم اول کی رو سے جو چیزیں حرام ہیں وہ (فطری وطبعی اعتبار سے) بذات خود حرام ہیں جبکہ دوسری قسم میں حرمت اضافی ہے اور اس کی تفصیل اس طرح ہے۔

(1) کوئی شخص کسی دوسرے کا مال یا تو اپنے اختیار سے لے گا یا بغیر اختیار کے، جیسے وراثت کا مال وجائیداد بغیر اختیار کے حاصل ہوتا ہے۔

(2) پھر جو مال وہ اپنے اختیار میں لے گا اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ یا تو اس مال کا کوئی مالک نہ ہوگا، جیسے زمین سے نکلنے والے معدنیات، یا وہ کسی مالک مال سے ماخوذ ہوگا۔

(3) پھر جو مال مالک مال سے لیا جائے گا اس کی بھی مزید دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ یا تو وہ اس کی رضامندی سے لے گا یا زبردستی۔

(4) پھر جو مال زبردستی لیا جائے گا اس کی بھی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ یا تو وہ اس کے مالک کی ملکیت سے ساقط ہوجانے کی بناپر ہوگا جیسے (جنگ کے ذریعے حاصل ہونے والا) مال غنیمت، یا اس کا لینا کسی استحقاق کی بناپر ہوگا جیسے زکوۃ ادا کرنے سے انکار کرنے والوں سے زبردستی زکوۃ وصول کرنا یا نقصانات واجبہ کا لینا۔

(5) پھر جو مال رضامندی سے لیا جائے اس کی بھی دو قسمیں: یا تو وہ کسی معاوضہ کی بنا پر ہوگا جیسے خرید وفروخت، مہر اور اجرت۔ یا بغیر کسی عوض کے ہوگا جیسے ہبہ اور وصیت اس اعتبار سے حلال وحرام کی چھ قسمیں ہوئیں، جن کی تفصیل اس طرح ہے۔

(1) وہ چیزیں جن کا کوئی مالک نہ ہو جیسے معدنیات، بنجر زمین کو آباد کرنا، شکار کرنا، لکڑیاں اکٹھا کر کے لانا، نہروں سے پانی سینچنا اور گھاس چھیل کر لانا وغیرہ۔ یہ سب چیزیں حلال ہیں بشرطیکہ وہ کسی شخص کی حدود ملکیت کے دائرہ میں نہ آتی ہوں۔

2- وہ چیزیں جو کفار ومشرکین سے جنگ کے بعد بزور شمشیر حاصل ہوئی ہوں یعنی مال غنیمت جس کا پانچواں حصہ نکال کر باقی مستحقین میں عدل وانصاف کے ساتھ تقسیم کیا گیا ہو۔

3- وہ مال جو کسی استحقاق کی بناپر مال کی رضامندی کے بغیر زبردستی وصول کیا جائے جب کہ حقدار کا حق پورا ہوجائے تو یہ چیز حلال ہے۔

4- وہ مال جو باہمی رضامندی سے بطور معاوضہ لیا جائے۔ جب اس میں معاوضہ کی شرائط کا لحاظ رکھا جائے تو یہ حلال ہے۔

5- وہ مال جو رضامندی سے بغیر کسی عوض کے لیا جائے جیسے ہبہ، وصیت اور صدقہ، جبکہ اس کی شرائط کا لحاظ رکھا جائے۔ (تو یہ بھی حلال ہے)

6- وہ چیز جو بغیر اختیار کے حاصل ہوتی ہے جیسے میراث، یعنی وراثت کا مال، تو یہ بھی حلال ہے۔

اب رہا وہ مال اور ہر وہ مسئلہ جو مذکورہ بالا چھ اقسام کے خلاف ہو وہ حرام ہے اور ایسی

تمام ناجائز قسمیں "وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ" (سورۃ بقرہ 2 آیت 188) (اور تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق مت کھاؤ) کے تحت آتی ہیں۔ (تفسیر کبیر امام رازی جلد پنجم صفحہ 117)

اسلامی شریعت کا معجزہ

یہ ایک بصیرت افروز بیان اور ایک حکیمانہ اصول ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ معاملات زندگی سے متعلق شریعت کا یہ ایک اصول قاعدہ وضابطہ اور ایسی میزان ہے جس میں دنیا کی ہر چیز اور ہر معاملے کو تول کر حق و باطل اور کھرے و کھوٹے کا حال بخوبی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے اسلامی شریعت میں ایسے بہت سے قیمتی اصول ہیں جو جامع اور ہمہ گیر کلیات کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس اعتبار سے اسلامی قانون ایک اٹل، محکم اور دائمی قانون ہے، جو دنیا کے دیگر تمام قوانین اور تمام شرائع میں ممتاز اور سب سے فائق نظر آتا ہے۔ اسی بنا پر وہ ہر دور میں نوع انسانی کی بخوبی رہنمائی کر سکتا ہے اور اس پر کہنگی و بوسیدگی کی پرچھائیاں کبھی نہیں پڑ سکتیں اور وہ کسی بھی مشکل سے مشکل مسئلے کو حل کرنے میں عاجز اور بے بس نہیں ہو سکتا۔ اس اعتبار سے اسلامی شریعت کی جامعیت و کاملیت ایک معجزہ دکھائی دیتی ہے جو اس کے من جانب اللہ ہونے کی واضح اور ناقابل تردید دلیل ہے۔ اگر یہ قانون کسی انسان کا بنایا ہوا ہوتا تو اس میں ہر دور کی مناسبت و رعایت سے صادق آنے والے وسیع اور لازوال کلیات موجود نہ ہوتے جو ہر دور کے مسائل و مشکلات کا احاطہ کرنے والے ہوں کیونکہ ہمارا تجربہ بتاتا ہے کہ انسان کا بنایا ہوا قانون ہزار دو ہزار سال تو بہت دور کی بات ہے دو چار صدیاں بھی بغیر کسی ترمیم و تنسیخ کے نہیں چل سکتا بلکہ انسانی ساختہ قوانین میں تو دس بیس سال ہی میں اتنی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں کہ ان کا حلیہ بگڑ کر رہ جاتا ہے۔

غرض قرآن حکیم کے ایک لفظ "باطل" کی تشریح و تفسیر میں مفسرین و محققین نے صفحات کے صفحات سیاہ کر ڈالے ہیں اور اس کے مختلف فقہی و قانونی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ مگر یہ اس لفظ کی مکمل تشریح و تفہیم نہیں ہے۔ اس معجزانہ لفظ میں "مال باطل" کے جتنے بھی پہلو ہو سکتے ہیں اور قیامت تک اس سلسلے میں جو بھی مسائل پیش آ سکتے ہیں ان سب کا

احاطہ اس مختصر سے کلیہ میں پوری جامعیت کے ساتھ کر دیا گیا ہے۔ جن کا مصداق ہر دور میں صادق آ سکتا ہے۔ اس طرح اسلامی شریعت ہر دور کے مشکل سے مشکل احوال و مسائل سے نبٹنے کی بخوبی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ ہے دین برحق کی کاملیت و جامعیت کا ایک نظارہ اور اس کا ثبوت۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (سورۃ مائدہ 5 آیت 3) آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے۔

اسی بنا پر ارشاد فرمایا گیا ہے۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (سورۃ آل عمران 3، آیت 85) اللہ کے نزدیک (پسندیدہ) دین صرف اسلام ہے، اسی بنا پر اسلامی قانون کو ترک کر کے دیگر قوانین کی طرف رجوع کرنا جاہلی قوانین کی طرف رجوع کرنا ہے کیونکہ عقلی، فطری اور محسن انسانیت قانون صرف اسلامی قانون ہے جس میں حد درجہ توازن اور معاشرتی عدل اور اعتدال کا لحاظ رکھا گیا ہے اور جو ہر قسم کی اونچ نیچ سے عاری پوری دنیائے انسانیت کے لئے رحمت کا باعث ہے۔ صرف اخروی نجات ہی کے اعتبار سے نہیں بلکہ معاشرتی، تمدنی اور اجتماعی نقطہ نظر سے بھی اس سے بہترین قانون کا نظارہ نوع انسانی نے اب تک نہیں کیا ہے۔

خلاصہ بحث یہ کہ موجودہ دور میں جہیز اور جوڑے گھوڑے کا جو غیر معقول، غیر فطری اور خوفناک رواج چل پڑا ہے جو حقیقتاً فساد تمدن کا باعث ہونے کی بنا پر قاتل انسانیت ہے، اس کا مقابلہ آج سوائے اسلام کے دنیا کا کوئی مذہب نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے ابدی قانون اور ابدی کلیات کے باعث اس شجر خبیث کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ اللہ کے چند مخلص بندے اس سماجی برائی کو مٹانے کے لئے اپنا ایک دینی فریضہ سمجھ کر میدان میں کود پڑیں اور یہ وقت کا سب سے بڑا جہاد ہے جس کے لئے ایک باقاعدہ تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔ ورنہ یہ خبیث اور ملعون رسم پورے معاشرے کو ہڑپ کر لے گی جو معاشرہ کے قتل عام کے مترادف ہے حالانکہ معاشرے کو بچانا ایک خدائی فریضہ ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ: اپنے آپ کو ہلاک مت کرو (سورۃ نساء 4، آیت 29)

قلب کی اصلاح اوراس کی اہمیت

نیکی کیا ہے اور گناہ کیا ہے؟ اس کا حال یا اس کی صحیح حقیقت معلوم کرنے کے لئے کسی مفتی سے فتویٰ پوچھنے کی ضرورت نہیں بلکہ دنیا کے سب سے بڑے معلم اخلاق ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلے میں ایک ایسا حکیمانہ اور قیمتی اصول بیان فرمادیا ہے کہ ہر شخص اپنا مفتی آپ بن سکتا ہے۔ چنانچہ اس سوال کے جواب میں کہ نیکی کیا ہے اور گناہ کیا ہے؟ آپ نے ہر شخص کو اپنے ضمیر کی طرف رجوع کرنے اور اس کی آواز کی طرف کان دھرنے کی تلقین فرمائی ہے اور یہ اخلاقیات کا سب سے پہلا اور نہایت درجہ کارگر اصول ہے کہ اصلاح باہر سے نہیں بلکہ اندر سے ہونی چاہئے اور اس سلسلے میں سب سے پہلے قلب درست ہونا چاہئے۔

اَلْبِرُّ حُسْنُ الْاَخْلَاقِ وَالْاِثْمُ مَا حَاکَ فِیْ صَدْرِکَ وَ کَرِهْتَ اَنْ یَّطَّلِعَ عَلَیْهِ النَّاسُ: نیکی حسن اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹک جائے اور تم اس بات کو ناپسند کرنے لگو کہ لوگ تمہارے دل کی بات سے آگاہ ہوجائیں۔ (صحیح مسلم کتاب البروصلۃ)

اس اعتبار سے جب تک انسان کے دل کی اصلاح نہ ہو اس کا عمل و کردار درست نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا انبیائے کرام کی دعوت کا اصلی مرکز ومحور دل کی اصلاح ہوتا ہے۔ اگر دل (قلب) کی اصلاح ہوجائے تو پورا نقطہ نظر ہی بدل جائے گا اور معیشت و معاشرت اور تمدن و سیاست وغیرہ تمام میدانوں میں آپ سے آپ ایک انقلاب رونما ہوجائے گا اور معاملات زندگی میں جو ہولناکی اور فریب کاری نظر آرہی ہے وہ خود بخود ختم ہوجائے گی، معاشرتی وتمدنی مفاسد کا خاتمہ ہوجائے گا اور اجتماعی زندگی میں عدل اور خدا پرستی کا دور دورہ عام ہوجائے گا۔ بشرطیکہ قلب کا زاویہ اور اس کا نقطہ نظر بدل جائے اور اس میں "غصب حقوق" کے بجائے خلوص اور للّٰہیت آجائے اور عدل ومساوات کی بنیاد پر پوری انسانی

برادری سے مساویانہ اور عدل گستانہ سلوک کرکے دنیائے انسانیت کو امن وامان اور چین وسکون کا سانس لینے کا موقع دے اور کوئی ایسی حرکت نہ کرے جس سے امن عالم میں یا معاشرہ میں خلل پیدا ہونے یا کسی قسم کا معاشرتی فساد برپا ہونے کا اندیشہ پیدا ہوسکتا ہے، چنانچہ قرآن حکیم میں ایک جگہ تول اور ناپ میں کمی کرنا بھی ایک معاشرتی فساد قرار دیا گیا ہے۔ جو لوگوں کے لین دین اور معاملات زندگی سے متعلق ہونے کی بنا پر ایک قومی خیانت اور لوگوں کے حقوق غصب کرنے کی ایک واضح حرکت ہے۔ چنانچہ حضرت شعیب علیہ السلام کی زبان سے ان کی قوم کو بطور تنبیہ کہلوایا گیا۔

یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ قَدْ جَآءَتْکُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ فَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَ الْمِیْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (سورۃ اعراف 7، آیت 85) اے میری قوم! اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔ تمہارے رب کی جانب سے تمہارے پاس دلیل پہنچ چکی ہے۔ لہٰذا ناپ اور تول کو پورا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کرنہ کرو اور زمین میں اصلاح کے بعد فساد نہ کرو۔

اس اعتبار سے لوگوں کے حقوق غصب کرنا زمین میں فساد برپا کرنا اور فتنہ پھیلانا ہے اور قرآن حکیم کے دیگر مقامات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ مختلف قسم کی معاشرتی و اجتماعی حق تلفیوں اور سماجی برائیوں کو قرآن میں فساد اور ظلم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بہرحال ان معاشرتی اور اجتماعی برائیوں اور حقوق سے متعلق حق تلفیوں کی اصلاح کے لئے سب سے پہلے قلب کی اصلاح ضروری ہے۔ اسی لئے ایک حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔

اَلَا وَ اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ وَ اِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ، اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ: خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ جسم کے اندر گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو اگر درست ہوجائے تو سارا جسم درست ہوجائے گا اور اگر وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جائے گا۔ ہاں تو وہ قلب ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الایمان 19/1 صحیح مسلم کتاب المساقاۃ 1220/3)

جہیز مرد کی ذمہ داری

مذکورہ بالا مباحث سے جہیز کی شرعی حیثیت اور اس کے معاشرتی مفاسد کا حال اچھی طرح واضح ہو گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی شریعت نے لڑکی کے باپ پر یہ فریضہ ہرگز عائد نہیں کیا ہے کہ وہ اپنے داماد کا گھر بسانے کے لئے گھریلو سامان (مثلاً پلنگ، بستر، کھانے پکانے کے برتن اور دیگر گھریلو اشیاء) وغیرہ بھی فراہم کرے۔ (فرمائشی جہیز اور جوڑے گھوڑے کی رقم وغیرہ دینا تو بہت دور کی بات ہے) ہاں اگر لڑکی کا باپ یا اس کا کوئی دوسرا سرپرست اپنی خوشی سے بغیر کسی مطالبے کے اپنی لڑکی کو کوئی چیز دے دے تو وہ بالکل حلال ہے۔ مگر مطالبہ کر کے لڑکی کے باپ یا اس کے سرپرستوں سے کوئی چیز وصول کرنا بالکل جائز نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں صاف صاف ارشاد فرمایا ہے کہ عورتوں پر مال خرچ کرنا مردوں (شوہروں) کی ذمہ داری ہے کیونکہ عورتوں پر مردوں کی فضیلت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مرد عورت پر اپنا مال خرچ کرتا ہے۔ اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر بالادستی عطا فرمائی ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ (سورۃ نساء 4 آیت 34) مرد عورتوں پر بالادست ہیں کیونکہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ مردوں نے اپنا مال (عورتوں پر) خرچ کیا ہے۔ تو (اس بنا پر) نیک عورتیں وہ ہیں جو (مردوں کی) تابعدار اور ان کی پیٹھ پیچھے (ان کے مال و متاع کی) حفاظت کرنے والی ہوں۔ (نساء 4 آیت 34)

مردوں کو عورتوں پر فضیلت کی وجہ کیا ہے؟ تو امام رازی کی تصریحات کے مطابق اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں اور ان تمام کا دارومدار دو باتوں پر ہے کہ علم اور جسمانی قوت و طاقت میں مرد عورتوں سے برتر ہوتے ہیں۔ چنانچہ مرد زیادہ علوم پر حاوی ہوتا ہے اور وہ عقلی اعتبار سے پختہ کار ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ مشکل اور محنت کے کام انجام دیتا ہے، شہسواری اور تیراندازی میں فائق ہوتا ہے، مردوں میں انبیاء اور علماء ہوتے ہیں وہ امامت کبریٰ وصغریٰ

کے مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ (خلیفہ اور نمازوں کے امام ہوئے ہیں) جہاد، اذان، خطبہ، اعتکاف میں حصہ لینے اور حدود و قصاص میں شہادت دینے کے وہی حقدار ہوتے ہیں۔ (تفسیر کبیر جلد دہم صفحہ 88)

(اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سی خصوصیات ہیں جو مردوں کا خاصہ ہیں) مگر اس آیت میں نظم کلام کی وجہ یہ ہے کہ جب سورۂ نسا کی آیت 32 (**وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ** ...... اور اللہ نے بعض کو بعض پر جو فضیلت عطا کی ہے اس پر ہوس مت کرو......) کے مطابق عورتوں نے مردوں کو میراث میں دوگنا حصہ دیئے جانے پر شکایت کی تھی (کہ عورتوں کو صرف ایک حصہ اور مردوں کو دو حصے کیوں دیئے جاتے ہیں؟) تو زیر بحث آیت (نساء 34) میں اللہ تعالیٰ میراث میں مردوں کی عورتوں پر فضیلت کی وجہ بیان کر رہا ہے کہ مرد عورتوں کے رکھوالے ہیں۔ اگرچہ جسمانی اعتبار سے مرد اور عورت ایک دوسرے سے لطف اندوز ضرور ہوتے ہیں مگر اللہ نے مردوں کو عورتوں کا مہر اور نفقہ ادا کرنے کا پابند بنا کر مردوں پر ایک زائد بوجھ ڈالا ہے۔ اس اعتبار سے مردوں کی فضیلت ظاہر ہے۔ (تفسیر کبیر جلد دہم صفحہ 87)

اس اعتبار سے مردوں کی عورتوں پر فضیلت اور برتری کی ایک قوی وجہ مردوں کا عورتوں پر اپنا مال خرچ کرنا ہے اور مال خرچ کرنے کی کیفیت کیا ہوگی؟ اس کی دو شکلیں مفسرین نے بیان کی ہیں۔ چنانچہ امام رازی اس فقرہ (**بما انفقو امن اموالھم**: چونکہ مردوں نے اپنا مال خرچ کیا ہے) یعنی عورتوں پر، کی تفسیر میں مزید تحریر فرماتے ہیں۔

یعنی الرجل افضل من المراۃ لانه یعطیھا المھر و ینفق علیھا: یعنی مرد عورت سے افضل ہے کیونکہ وہ اس کا مہر دیتا ہے اور اس کا نفقہ ادا کرتا ہے۔ (تفسیر کبیر جلد دہم، صفحہ 87)

اور امام قرطبی نے بھی تقریباً یہی بات تحریر کی ہے کہ مردوں کی فضیلت کی وجہ یہ ہے کہ وہ عورتوں کا مہر اور نفقہ ادا کرتے ہیں۔ (**تفضیلھم علیھن فی الارث لما علی الرجال من المھر و الانفاق**) تفسیر قرطبی جلد پنجم صفحہ 169

اس طرح عام مفسرین نے مال خرچ کرنے سے مراد عموماً یہی دو باتیں بیان کی ہیں کہ

اس سے مراد مہر اور نفقہ ہے۔ مگر یہاں پر اسلوب کلام اور الفاظ کی عمومیت کے لحاظ سے اس میں ہر قسم کے مالی اخراجات خواہ وہ نکاح سے متعلق ہوں یا گھریلو ضروریات سے (جو عموماً جہیز کے دائرہ میں آتے ہیں) وہ سب کے سب "انفاقِ اموال" (مال خرچ کرنے) میں شامل و داخل ہو سکتے ہیں کیونکہ نفقہ کے ساتھ ساتھ عورت کے لئے جائے رہائش (سکنیٰ) فراہم کرنا بھی مرد پر واجب ہے۔ جیسا کہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ میں تصریح موجود ہے۔

"النفقةُ واجبة" للزوجة على زَوجها مسلمةً كانت او كافرةً اذا سلمت نفسها الى منزله، فعليه نفقتها و كسوتها و سُكناها:

بیوی کا نفقہ (خرچہ) اس کے شوہر پر واجب ہے خواہ عورت مسلمان ہو یا غیر مسلم، جب کہ وہ اپنے آپ کو شوہر کے حوالے کر کے اس کے گھر آ جائے۔ تو اس وقت شوہر پر بیوی کا خرچہ، اس کی پوشاک اور اس کے لئے رہنے کی جگہ فراہم کرنا واجب ہے۔ (صفحہ 417 ہدایہ اولین، صفحہ 417، مطبوعہ مجتبائی)

اس طرح رہنے کے مکان کے ساتھ لوازم بیت کی فراہمی بھی شوہر کے ذمہ واجب ہے۔ ان چیزوں کی فراہمی پر دلہن یا اس کے سرپرستوں کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن اور حدیث میں کہیں بھی اس کا اشارہ تک نہیں ملتا کہ اس قسم کی چیزوں کی فراہمی لڑکی یا اس کے باپ کی ذمہ داری ہے کیونکہ یہ ایک خلاف عقل اور خلاف فطرت قانون ہے۔

چنانچہ اس سلسلے میں علامہ ابن کثیر نے زیر بحث آیت کی تفسیر میں ایک نکتے کی بات تحریر کی ہے کہ مہر اور نفقے کے علاوہ اس میں ہر قسم کے اخراجات بھی شامل ہو سکتے ہیں جن کی ادائیگی کی تاکید قرآن اور حدیث میں کی گئی ہے۔ اسی بنا پر مرد کو گھر کا "قیم" یعنی نگراں اور ناظم اعلیٰ مقرر کیا گیا ہے۔

(وَبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ) أى مِن المُهور و النَّفَقات و الكُلَف التى أوجَبَها اللّٰهُ عليهم لهنّ فى كتابه و سُنّة نبيّه صلّى اللّٰه عليه وسلّم. فالرجلُ أفضلُ من المرأة فى نفسه، وله الفضلُ عليها و الافضالُ، فناسبَ أن يكون قيّمًا عليها كما قال اللّٰه تعالىٰ (وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ) (تفسیر کبیر جلد اول صفحہ 491)

اس لحاظ سے عورت سے جہیز اور وہ بھی ڈھیر سارا جہیز لانے کا مطالبہ کرنا غیر شرعی و غیر اسلامی مطالبہ ہے اور پھر موجودہ دور کی خرافات مثلاً فریج، ٹی وی، صوفہ سیٹ، سلیگ فین، ریڈیو، واشنگ مشین اور وی سی آر وغیرہ کا جہیز اور مقصد نکاح سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سب تعیشات کی چیزیں ہیں جن کا مطالبہ سسرال والوں سے کرنا حد درجہ شرمناک اور قابل ملامت فعل ہے۔

آیت زیر بحث میں مردوں اور عورتوں کے حدود اور ان کے فرائض پر بڑے بلیغ اور معنی خیز انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ چنانچہ مردوں کی ذمہ داری یہ بتائی کہ مالیات سے متعلق جتنے بھی مسائل ہو سکتے ہیں ان سب کی فراہمی مرد کا ذمہ ہے خواہ وہ خوراک سے متعلق ہوں یا پوشاک سے یا گھریلو اشیا اور اثاثہ جات سے۔ اسی بنا پر مرد کو گھر کا نگراں اور رکھوالا مقرر کیا گیا ہے۔ چنانچہ دنیا کے قدیم و جدید تمام قوانین میں مرد کی یہ حیثیت و اہمیت بالکل مسلم اور ناقابل تردید رہی ہے۔ حتیٰ کہ موجودہ سیکولر قوانین میں بھی عورتوں کا نان و نفقہ MAINTENANCE مردوں ہی سے دلایا جاتا ہے۔

اور عورتوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ مردوں کے مال خرچ کرنے کے عوض میں اپنے شوہروں کی اطاعت گزاری کریں۔ چنانچہ ایسی اطاعت گزار عورتوں کو قرآن حکیم نیک عورتوں کے خطاب سے نوازتا ہے۔ (فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ") (سورۃ نساء 4، آیت 34) اور عورتوں کی دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ مردوں کے پیٹھ پیچھے (ان کی غیر حاضری میں) ان کے مال و اسباب اور ان کے دیگر حقوق کی دیکھ بھال کریں) (حَافِظَاتٌ" لِّلْغَيْبِ) (سورۃ نساء 4، آیت 34) چنانچہ اس آیت کی تفسیر میں مسند ابوداؤد طیالسی میں ایک حدیث اس طرح مروی ہے۔

خَيْرُ النِّسَاءِ الَّتِي إِذَا نَظَرْتَ إِلَيْهَا سَرَّتْكَ، وَ إِذَا أَمَرْتَهَا أَطَاعَتْكَ وَ إِذَا غِبْتَ عَنْهَا حَفِظَتْكَ فِي نَفْسِهَا وَ مَالِكَ: سب سے بہتر عورت وہ ہے کہ جب تو اس کی طرف دیکھے تو وہ تجھے مسرور کر دے اور جب تو اسے کسی بات کا حکم کرے تو وہ اسے بجالائے اور جب تو اس کی نظروں سے اوجھل ہو جائے تو وہ اپنے نفس اور تیرے مال کے بارے میں تیری حفاظت کرے۔ (تفسیر قرطبی جلد پنجم صفحہ 179)

امام رازی تحریر کرتے ہیں کہ کسی شخص کی غیر موجودگی میں اس کے حقوق کی حفاظت کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں جو یہ ہیں۔

(1) وہ اپنے آپ کو زنا سے بچائے تاکہ اس کے سبب سے شوہر کو کوئی عار یا کلنک کا ٹیکہ لگنے نہ پائے۔

(2) شوہر کی غیر حاضری میں شوہر کے مال کی حفاظت (اس کی نائب بن کر) کرے۔

(3) گھریلو معاملات سے مناسب طریقے سے نپٹے۔ (تفسیر جلد دہم صفحہ 89)

ظلم اور ناحق کوشی کا انجام

یہ ہیں عورت کے بنیادی اور اصلی فرائض۔ اس طرح اسلامی شریعت نے عورت اور مرد کے حقوق اور ان کے حدود و فرائض کو نہایت درجہ واضح اور صاف و صریح الفاظ میں بیان کر دیا ہے اور دونوں کے دائرہ کار کی پوری طرح وضاحت کر دی ہے۔ دین و دنیا دونوں جہانوں کی سعادت عورت اور مرد کے ان حدود و فرائض کی ادائیگی ہی پر موقوف ہے۔ اب کسی بھی درجے میں اس ترتی کو الٹنا یا عورت پر اس کی اصل فطرت و طاقت سے بڑھ کر ایک زائد بوجھ ڈالنا (خواہ موجودہ دور کی طرح مالیاتی شعبہ بھی اس کے حوالے کرنے کے اعتبار سے ہو یا جوڑا جہیز کے غلط مطالبات کی وجہ سے ہو) نظام فطرت اور قانون خداوندی کو بدل ڈالنے کی کوشش کرنا ہے۔ بلکہ یہ بات قانون خداوندی سے بغاوت کے مترادف ہوگی، جو فساد معاشرت اور فساد تمدن کا باعث ہے اور جو لوگ قانون خداوندی اور قانون فطرت سے بغاوت کریں وہ اپنے انجام کو ضرور پہنچ کر رہیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ حقوق العباد کی پامالی یا سماجی ظلم کو کبھی برداشت نہیں کرتا بلکہ وہ اس سلسلے میں قوموں کو ڈھیل دیتا رہتا ہے اور فوراً مواخذہ کرنے کے بجائے انہیں سدھرنے اور اپنی غلطیوں کو درست کرنے کا موقع دیتا رہتا ہے۔ مگر اس کے باوجود کوئی ظالم قوم اور ظالم معاشرہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا تو پھر عذاب الٰہی اچانک اور دبے پاؤں آتا ہے جو ظالم قوموں کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر رکھ دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں اس خدائی قانون اور سنت الٰہی کے بارے میں واضح تنبیہات مذکور

ہیں جن کو فراموش کر کے بیٹھنے والی غافل قومیں اپنے انجام بد کو ضرور پہنچ کر رہیں گی۔

وَ كَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِيْنَ (سورۃ انبیاء 21، آیت 11) اور ہم نے کتنی ہی بستیوں کو نیست و نابود کر دیا جو ظالم بن چکی تھیں اور ان کے بعد ہم نے دوسری قوم پیدا کی۔

وَ مَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰى اِلَّا وَ اَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ: (سورۃ قصص 28 آیت 59) اور ہم بستیوں کو اس وقت تک برباد نہیں کرتے جب تک وہ ظالم اور ناحق کوش نہ بن جائیں۔

وَمَا اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتٰبٌ مَّعْلُوْمٌ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَ مَا يَسْتَاْخِرُوْنَ: (سورۃ حجر 15 آیت 4 سے 5) اور ہم نے جس بستی کو بھی تباہ کیا اس کے لئے ایک وقت مقرر کر دیا تھا۔ چنانچہ کوئی قوم نہ تو اپنے وقت معین سے آگے بڑھ سکتی ہے اور نہ پیچھے ہٹ سکتی ہے۔

یہ قرآن کریم کے چند وسیع اور ہمہ گیر کلیات ہیں جن کا اطلاق قوموں اور ملتوں پر مختلف حیثیتوں سے ہوسکتا ہے۔ اصل میں یہ اصول فلسفہ تاریخ کے نقطہ نظر سے ہیں۔ چنانچہ اقوام عالم کے عروج و زوال کا دارومدار فلسفہ اخلاق سے ہے اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس قوم کے اخلاق و کردار درست ہوں اور ان کی زندگی معاشرتی، تمدنی اور اجتماعی نقطہ نظر سے معتدل اور افراط و تفریط سے پاک ہو وہ زیادہ عرصے تک دنیا کے اسٹیج پر برقرار رہتی ہے اور جس معاشرے میں سماجی ظلم اور انتہا پسندی آ گئی ہو اور اس کا مزاج و کردار بگڑ چکا ہو وہ بہت جلد دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے، دنیا میں ازل سے یہی دستور جاری رہا ہے اور ابد تک یہی دستور خداوندی جاری و ساری رہے گا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ایک موقع پر اس قانون الٰہی کی تشریح کرتے ہوئے بعض ظالم قوموں کو ان کے ظلم اور نافرمانی کی پاداش میں ہلاک کرنے کا تذکرہ کرنے کے بعد بطور تنبیہ فرمایا گیا ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ: (سورۃ یونس 10، آیت 14) پھر ہم نے تمہیں ان (ظالم قوموں کی ہلاکت) کے بعد زمین میں خلیفہ بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو۔

ایک الٰہی اصول

یعنی کسی ظالم اور ناحق کوش قوم کو ہلاک کرنے کے بعد دوسری قوم کو اس کی جگہ لایا جاتا ہے اور اسے حسن عمل اور حسن اخلاق کا مظاہرہ کرنے کا موقع اور پوری پوری مہلت دی جاتی ہے۔ نیز مختلف حیثیتوں سے بار بار اسے متنبہ کیا جاتا ہے۔ مگر جب وہ ساری الٰہی تنبیہات کو نظر انداز کر کے پوری ڈھٹائی کے ساتھ اپنی بدعملی اور ناحق کوشی میں مست و مگن ہو جاتی ہے تو پھر عذاب الٰہی بالکل دبے پاؤں آتا ہے اور اس ظالم و باغی قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا ہے یا پھر اس پر دوسری قوموں کو مسلط کر دیتا ہے جو ان کی غلام بن کر اپنے کیے کا مزا چکھتی رہتی ہے۔ چنانچہ پہلے اصول کی تشریح اس طرح کی گئی ہے جو ظالم و نافرمان قوموں کے سلسلے میں ہے۔

......فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (سورۃ اعراف 7 آیت 95) پھر ہم نے انہیں اچانک اس طرح پکڑا کہ انہیں خبر ہی نہ ہوئی۔

اور دوسرے اصول کی تشریح بنی اسرائیل کے واقعات میں اس طرح ملتی ہے کہ الٰہی تنبیہ کے باوجود بنی اسرائیل نے جب اللہ قدوس کی نافرمانی کی اور سرکشی کا مظاہرہ کیا تو ان پر ظالم قوموں کو مسلط کر دیا گیا، جنھوں نے ان کے گھروں کو اجاڑ دیا اور ان کے ساتھ ذلت ناک سلوک کرتے رہے۔

فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا (بنی اسرائیل 17، آیت 5) پھر جب پہلا وعدہ آیا تو ہم نے تم پر اپنے ایسے بندوں کو مسلط کر دیا جو بڑے جنگجو تھے وہ تمہارے گھروں میں گھس پڑے۔ اس طرح اللہ کا وعدہ پورا ہوا (کہ نافرمانوں کو ان کی سزا ضرور مل کر رہے گی)۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس قسم کے واقعات محض داستان سرائی کے طور پر نہیں بلکہ امت محمدی کی تنبیہ اور انتباہ کے طور پر بیان کیے ہیں کہ اگر تم نے بھی قانون الٰہی سے سرکشی اور احکام الٰہی سے نافرمانی کی روش اختیار کی تو تمہارا بھی یہی انجام ہوگا۔ چنانچہ آج اہل

اسلام پر جو ظالم و جابر قومیں مسلط کر دی گئی ہیں وہ اللہ قدوس کی نافرمانی اور سرکشی کے نتیجے میں ہے اور اس اعتبار سے آج ہمارا حال بنی اسرائیل سے مختلف ہے۔ یہ اللہ کا ازلی و ابدی قانون ہے جس میں کبھی ردو بدل نہیں ہوتا۔ لہٰذا اہل اسلام کو غیر قوموں کی نقالی اور نفس کی پیروی سے اجتناب کرتے ہوئے قانون الٰہی کی پابندی کرنی چاہئے، جو ہماری دینوی اور اخروی نجات کا باعث ہے۔

اسلامی قانون سے دوری

واقعہ یہ ہے کہ بات محض جہیز ہی کی نہیں بلکہ ایسے کتنے ہی غیر اسلامی رسوم و رواجات ہیں جو غیر قوموں سے میل و ملاپ کے نتیجے میں آج ہمارے معاشرے میں در آئے ہیں اور ہماری تہذیب و معاشرت کا جزو بن چکے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ آج ہم نے اصل اسلامی قانون کو بھلا دیا ہے اور غیر قوموں کی نقالی میں اتنی دور نکل گئے ہیں کہ اب ہمیں اصل اسلامی قانون بالکل ہی اجنبی لگ رہا ہے۔ اصل اسلامی قانون کی رو سے عورت کا مہر نکاح کے موقع پر یا نکاح کے بعد واجب ہو جاتا ہے۔ مگر ہم ہندو تہذیب کی نقالی میں عورت کا یہ شرعی حق ادا نہیں کرتے بلکہ مختلف حیلے بہانوں سے اسے ٹالتے رہتے ہیں اور اکثر و بیشتر مرتے وقت بخشوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح ہندو قانون کی دیکھا دیکھی مسلمان بھی لڑکیوں اور بہنوں کو وراثت میں حصہ نہیں دیتے اور ان کا شرعی حق دبا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ہندو قانون و دستور کے مطابق مسلمانوں میں بھی ''مشترکہ خاندان'' کا تصور سرایت کر گیا ہے حالانکہ بیوی کو اگر سسرالی رشتہ داروں کے ساتھ رہنے میں اعتراض ہو تو شرعی اعتبار سے مرد پر لازم ہے کہ وہ اس کو الگ رکھنے کا انتظام کرے۔ اس طرح کی بہت سی باتیں ہیں، جن کی تفصیلات کا یہ موقع نہیں ہے۔

اسی طرح غیر مسلموں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں میں نہایت درجہ مسرفانہ طریقوں سے شادیاں ہوتی ہیں حالانکہ اسلامی شریعت کی رو سے نکاح کا انعقاد بالکل سادگی اور سیدھے سادے طریقے سے ہونا چاہئے اور حدیث کی رو سے نکاح مسجدوں میں ہونا زیادہ بہتر ہے۔

اَعْلِنُوْا هٰذَا النِّكَاحَ وَاجْعَلُوْهُ فِي الْمَسَاجِدِ: نکاح کا اعلان کرواور اسے مسجدوں میں منعقد کرو۔(جامع ترمذی جلد سوم صفحہ 399)

مگر ہمیں نکاح کی محفل مسجدوں میں منعقد کرنے میں عار محسوس ہوتا ہے اور ہم غیر قوموں کی نقالی میں بڑے دھوم دھام کے ساتھ بارات نکالنے کو ترجیح دیتے ہیں اور وہ بھی اکثر و بیشتر بینڈ باجے کے ساتھ، جو ایک غیر اسلامی طریقہ ہی نہیں بلکہ سخت درجے کا منکر ہے اور پھر دور ونزدیک کے تمام رشتہ داروں اور تمام دوست واحباب کو مدعو کرکے پرتکلف ضیافت کرنا اور اس کے لئے شامیانے نصب کرنا یا بڑے بڑے شادی ہالوں کو بک کرکے شاہانہ ٹھاٹ کا مظاہرہ کرنا اور اس مقصد کے لئے قیمتی دعوت نامے چھاپ کر تقسیم کرنا سب بدعت واسراف اور غیر قوموں کی نقالی ہے۔ دور رسالت میں شادیاں اس طرح ہوتی تھیں کہ لوگوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی بلکہ بیٹھے بیٹھے اور باتوں باتوں میں (بغیر کسی اہتمام کے) نکاح ہوجایا کرتے تھے۔ چنانچہ مشہور صحابی حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ (جو مدینہ منورہ کے سب سے بڑے مالدار تھے) اپنا نکاح اس طرح کرلیتے کہ وہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک کو اطلاع دینا یا نکاح کی محفل میں آپ کو بطور خیر وبرکت شریک کرانا ضروری نہیں سمجھتے۔ مگر جب وہ نکاح کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں تشریف لاتے تو آپ ان کے ہاتھ میں مہندی لگی ہوئی دیکھ کر دریافت کرتے ہیں کہ یہ رنگ کیسا ہے؟ تو عبدالرحمان بن عوف عرض کرتے ہیں کہ میرا نکاح ہوا ہے۔ تو آپ انہیں برکت کی دعا دے کر ولیمہ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ یہ واقعہ حدیث کی تمام مستند کتابوں (صحاح ستہ) میں موجود ہے۔ اسی طرح بعض صحابہ کا نکاح رسول اللہ نے باتوں باتوں میں کردیا۔ (جامع ترمذی جلد سوم صفحہ 421 سے 422)

اسلامی شریعت کے مطابق نکاح کے لئے دو چیزیں اہم ہیں: دو گواہوں کی موجودگی

اور ایجاب وقبول۔ یہ دو باتیں نکاح کے ارکان شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ دو مزید چیزیں بھی ضروری ہیں۔ ایک عورت کا مہر اور دوسرا نکاح کا اعلان۔ یعنی نکاح اگرچہ دو گواہوں کی موجودگی میں منعقد ضرور ہوجاتا ہے مگر اس کا اعلان عام ہوجانا معاشرتی اعتبار سے ایک اچھی چیز ہے تاکہ کسی کو شبہ کا موقع باقی نہ رہے۔ اب رہا ولیمہ تو یہ مسنون ہے، شرعاً فرض یا واجب نہیں اور ولیمہ میں گوشت روٹی یا بریانی کا ہونا کوئی ضروری نہیں بلکہ چند قریبی احباب یا خاص خاص لوگوں کو کوئی بھی چیز کھلا دینا یا شربت وغیرہ پلا دینا بھی کافی ہوجائے گا۔ مگر اس سلسلے میں اپنی حیثیت سے بڑھ کر تکلف کرنا یا قرض وغیرہ لے کر خواہ مخواہ مشکلات میں پڑنا شرعاً جائز نہیں ہے اور نام ونمود کی خاطر اس راہ میں اسراف وفضول خرچی بالکل حرام ہے۔

جو قرآن کی نظر میں شیطان کے بھائیوں کا فعل ہے۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 27) اور نکاح میں خطبہ مسنونہ کی بھی اہمیت ہے۔ بس نکاح میں اتنی ہی باتیں ضروری ہیں اور ان کے علاوہ جو کچھ ہے غیر اسلامی طریقہ اور ایجاد بندہ ہے جو بدعات وخرافات میں شمار ہوسکتا ہے۔ اسلامی قانون ایک سادہ اور آسان قانون وضابطہ ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے ایک رحمت ہے جس پر امیر وغریب ہر شخص بغیر کسی دقت کے عمل کرسکتا ہے۔ مگر اس سادہ اور آسان قانون کو ہم نے محض اپنی حماقت کے باعث مشکل اور پیچیدہ بنالیا ہے۔ گویا کہ اپنے ہی ہاتھوں اپنی قبر کھودنے کا سامان کررہے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک مومن ومسلم کے لئے غیر اسلامی طریقوں اور غیر قوموں کی نقالی سے ہمیشہ اور ہر حال میں پرہیز کرنا ضروری ہے۔ ہم قانون الٰہی کی نافرمانی اور اس سے بغاوت کرکے اس کی رحمتوں کے مستحق کس طرح بن سکتے ہیں؟ اس کی حکم عدولی کرکے اس کی نوازشات کی امید کس طرح کرسکتے ہیں؟ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے جو کچھ فرمایا تھا وہ ہمارے حال زار پر بھی بخوبی صادق آرہا ہے۔

وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ (سورۃ بقرہ 2 آیت 40) اور تم میرا عہد پورا کرو۔ میں تمہارا عہد پورا کروں گا۔

اسلامی شریعت میں مانگنے کی مذمت

خواہ کوئی جہیز مانگے یا صدقہ

نکاح انبیاء کی سنت

نکاح کا مقصد موج ومستی نکالنا نہیں بلکہ اس کا اصل مقصد ایک طرف گناہ سے بچنا اور پاکیزہ زندگی گزارنا ہے تو دوسری طرف نسل انسانی کو بڑھانا اور اس کے تسلسل کو قائم رکھنا ہے۔ اسی بنا پر اسلام میں نکاح کو تجرد کی زندگی اور نفل عبادت سے بھی افضل قرار دیا گیا ہے کیونکہ نکاح کے ذریعے تہذیب اخلاق کا حصول ہوتا ہے اور معاشرتی فتنوں سے بچاؤ کے ساتھ ساتھ ایک صالح خاندان اور پاکیزہ معاشرہ کی بھی بنیاد پڑتی ہے اور نکاح کے ذریعے مرد اور عورت پر جو مالی واخلاقی اور معاشرتی وتمدنی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ان کی بنا پر ایک بہتر معاشرہ اور بہتر تمدن کا نشو ونما ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ایک حدیث کے مطابق نکاح کو انبیائے کرام کی سنت قرار دیا گیا ہے۔

اَرْبَعٌ مِنْ سُنَنِ الْمُرْسَلِيْنَ: اَلْحَيَاءُ وَ التَّعَطُّرُ وَالسِّوَاكُ وَالنِّكَاحُ: چار چیزیں پیغمبروں کی سنت میں سے ہیں۔ حیاء داری، خوشبو لگانا، مسواک کرنا اور نکاح کرنا (جامع ترمذی صفحہ 391)

نیز ایک اور حدیث کے مطابق رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے "تبتل" سے منع فرمایا ہے۔ یعنی ازدواجی زندگی کو ترک کر کے عبادت میں مشغول ہو جانا۔

عَنْ سَمُرَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنِ التَّبَتُّلِ:

حضرت سمرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے تبتل (نکاح سے کنارہ کشی) سے منع فرمایا۔ (جامع ترمذی صفحہ 393)

اس تاکید سے اسلام میں نکاح کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں مذکورہ ہے کہ انبیائے کرام کو دنیا میں اہل وعیال والے بنا کر بھیجا گیا تا کہ ان کی زندگیاں لوگوں کے لئے ایک نمونہ اور معیار کا کام دے سکیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً

(سورۃ رعد 13 آیت 38) اور ہم آپ سے پہلے کئی رسول (دنیا میں) بھیج چکے ہیں، جن کو ہم نے بیویوں اور اولاد سے نوازا تھا۔

نظام تمدن کا صلاح وفساد

اس اعتبار سے انبیائے کرام کی ازدواجی زندگی بھی ہمارے لئے ایک نمونہ اور ایک آئیڈیل کا کام دے سکتی ہے اور اس اعتبار سے ازدواجی زندگی کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ یہ ایک بہت بڑی معاشرتی ذمہ داری کا کام ہے اور نظام تمدن کا نشو ونما اور اس کا صلاح وفساد اسی معاشرتی ذمہ داری کے صلاح وفساد پر موقوف ہے۔

غرض نکاح کے ذریعے دراصل فرد اور معاشرے کے اخلاق وکردار کو درست کرنا اور نظام معاشرت ونظام تمدن میں سدھار لانا ہے اور یہ فوائد صرف اس وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب کہ مرد اور عورت دونوں اپنی اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے انہیں پوری طرح ادا کرنے والے ہوں۔ اللہ نے مرد کو جسمانی اعتبار سے قوی اور طاقتور بنا کر معیشت کا بار بوجھ اس کے کندھوں پر ڈالا ہے اور اسی بنیاد پر اس کو گھر کا رکھوالا (قوام) قرار دیا ہے۔ (سورۃ نساء 4 آیت 34) لہٰذا مرد کا اپنی اس فضیلت سے انکار (خواہ وہ جہیز کے مطالبے کے نام پر ہو یا اور کسی بھی اعتبار سے) خدائی نظام میں خلل ڈالنے والا اور نظام معاشرت میں فساد برپا کرنے والا ہوگا کیونکہ یہ عمل تمدن کی تعمیر نہیں بلکہ اس کی تخریب ہے۔

پرائے مال پر نظر ڈالنے کی مذمت

اس لحاظ سے معاشرہ کے سدھار کے لئے ہر قسم کی خود غرضیوں پر روک لگانا ضروری ہے کیونکہ بے جا لالچ اور خود غرضی تمام معاشرتی فتنوں کی جڑ ہے، جسے جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنا ضروری ہے۔ اسی بنا پر ایک حدیث کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض مال و دولت کی خاطر نکاح کرنے کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا کہ جو شخص مال کی خاطر نکاح کرے گا اللہ اسے کنگال کر دے گا۔

مَنْ تَزَوَّجَ امْرَأَةً لِعِزِّهَا لَمْ يَزِدْهُ اللّٰهُ اِلَّا ذُلًّا، وَ مَنْ تَزَوَّجَهَا لِمَالِهَا لَمْ يَزِدْهُ اللّٰهُ اِلَّا فَقْرًا، وَ مَنْ تَزَوَّجَهَا لِحَسَبِهَا لَمْ يَزِدْهُ اللّٰهُ اِلَّا دَنَاءَةً، وَ مَنْ تَزَوَّجَ اِمْرَأَةً لَمْ يُرِدْ بِهَا اِلَّا اَنْ يَغُضَّ بَصَرَهُ وَ يُحْصِنَ فَرْجَهُ اَوْ يَصِلَ رَحِمَهُ بَارَكَ اللّٰهُ لَهُ فِيْهَا وَ بَارَكَ لَهَا فِيْهِ: جس شخص نے کسی عورت سے (محض) اس کی شہرت کی بنا پر نکاح کیا تو اللہ اسے ذلیل کرے گا اور جس نے کسی ایسی عورت سے (محض) اس کے مال کی بنا پر نکاح کیا تو اللہ اس کے فقر و محتاجی میں اضافہ کردے گا اور جس کسی عورت نے محض اس کے حسب و نسب کی بنا پر نکاح کیا تو اللہ اسے پست و حقیر کردے گا اور جس نے کسی عورت سے نکاح اپنی نظر نیچی رکھنے، اپنی شرمگاہ کو برائی سے بچانے اور صلہ رحمی کی غرض سے کیا تو اللہ مرد و عورت دونوں کو خیر و برکت سے نوازے گا۔ (طبرانی منقول از فتح القدیر شرح ہدایہ جلد سوم صفحہ 102)

اس حدیث میں نکاح کے صحیح مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے لوگوں کو غلط مقاصد سے باز آنے اور اپنی نیتوں کو درست کرنے کی تعلیم و تلقین کی گئی ہے۔ اگر مسلمان سچے دل سے اپنے نبی کے اس فرمان پر عمل کریں تو آج ہماری زندگی میں ایک انقلاب آسکتا ہے اور غلط رسم و رواج کے باعث معاشرے میں جو اخلاقی فتنے برپا ہیں، جن کے باعث بہتوں کی زندگی ایک عذاب بلکہ جہنم کا نمونہ بنی ہوئی ہے۔ اس سے چھٹکارا مل سکتا ہے۔ حرص اور لالچ یوں بھی بری بلا ہے مگر پرائے مال پر نظر ڈالنا اور بلا مشقت اسے اینٹھنے کی کوشش کرنا نہ صرف اخلاقی اعتبار سے ایک گری ہوئی حرکت ہے بلکہ شرعی اعتبار سے بھی قابل مذمت ہے۔

گداگری کی ایک نئی قسم

مال و دولت کا مطالبہ نکاح کے مقاصد اور اس کے فلسفے سے میل نہیں کھایا، بلکہ یہ دراصل کاہلی اور کام چوری کی قبیل سے ہے جو نظام تمدن میں خلل پیدا کرنے کا باعث ہے، نکاح سے جو دینی و دنیوی اور روحانی و جسمانی فوائد حاصل ہوسکتے ہیں اور جو اخلاقی و شرعی فوائد مطلوب و مقصود ہیں، جہیز کے موجودہ غلط تصورات ان سب پر پانی پھیر دیتے ہیں اور انسان کو نرا حیوان اور خودغرض بنا کر ان تمام صالح مقاصد کی نفی کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ

جہیز کا مطالبہ گداگری (بھیک مانگنے) کی ایک نئی قسم ہے جو اخلاقی و روحانی اقدار کی نفی پر مبنی ہے۔ شرعی و اخلاقی اعتبار سے اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ آپ اس مسئلے پر جتنا بھی اور جس زاویہ سے بھی غور کیجئے آپ پر اس کی برائی اسی قدر واضح سے واضح تر ہوجائے گی اور جواز کی کوئی صورت نظر نہیں آئے گی اور جو لوگ جہیز کے مفاسد سے واقف ہوتے ہوئے بھی ڈھٹائی کے ساتھ اس کا مطالبہ کرتے ہیں وہ اخلاق و شرافت اور تہذیب و تمدن سے عاری اور انسانیت کے دشمن ہیں۔ اگرچہ ایسے لوگ صورتاً انسان نظر آتے ہوں مگر وہ حقیقتاً بھیڑیے ہیں۔ وہ شکل و صورت سے پڑھے لکھے اور "مہذب" نظر آتے ہوں مگر وہ واقعہ کے اعتبار سے جاہل اور کندہ ناتراش ہیں جو رحمان کے بندے کہلانے کے بجائے چڑھتے سورج کے پجاری اور روپے کے غلام ہیں۔ روپیہ پیسہ ہی ان کا سب سے بڑا خدا ہے۔ دو دن کی عیاشی کے لئے وہ اپنے دین و ایمان تک کو داؤ پر لگانے اور اپنے اخلاق و کردار کا سودا کرنے سے بھی پیچھے نہیں ہٹتے۔ بلکہ بھرے بازار میں خود کو نیلام کرنے کے لئے ہمیشہ اور ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ کوئی بھی زیادہ بولی بول کر انہیں خرید سکتا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ حیرت ان لوگوں پر ہوتی ہے جن کے یہاں خود اپنی لڑکیاں ہوتی ہیں، مگر لڑکوں کے لئے مطالبات کی ایک لمبی چوڑی فہرست ہمیشہ جیب میں پڑی رہتی ہے۔ گویا کہ ایسے غافل اور بدمست لوگوں کو اپنی لڑکیوں کا کوئی غم ہی نہیں ہے کہ اگر وہ اپنے لڑکوں کے لئے دوسرے سے مانگتے پھریں تو پھر کل یہی معاملہ خود ان کی اپنی لڑکیوں کے سلسلے میں بھی پیش آسکتا ہے! مثل مشہور ہے جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ جو بوؤ گے وہی کاٹو گے۔

غرض اسی طرح جہیز کی آگ میں پورا معاشرہ جل رہا ہے۔ اور ہر جگہ تباہی مچی ہوئی ہے۔ جو انسانی کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔ یہ دراصل اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی صریح خلاف ورزی کے نتیجہ ہے۔ جہیز کا فتنہ موجودہ دور کے معاشرتی فتنوں میں سب سے بڑا فتنہ ہے، جس کی وجہ سے آج خاندانوں کے خاندان تباہ و برباد ہو رہے ہیں اور ہر طرف ہاہاکار مچی ہوئی ہے۔ جو معاشرہ لالچی اور خودغرض بن جائے وہ کبھی پنپ نہیں سکتا۔ لہٰذا اس مہلک اور تباہ کن رسم کی بیخ کنی ضروری ہے جو نوجوان لڑکیوں کو خودکشی اور خودسوزی پر مجبور کر رہی

ہے اور ہزاروں لاکھوں گھروں میں ماتم بپا کئے ہوئے ہے۔

شریعت میں مانگنے کی مذمت

اگر لڑکی کے ماں باپ اپنی لڑکی کو اپنی خوشی سے کچھ دے دیں تو وہ بالکل جائز اور مباح ہے۔ مگر اس سلسلے میں ایک حبہ سیا۔ نک کا مطالبہ کرنا شرعاً ناجائز وحرام ہے۔ جہیز مانگنا اور بھیک مانگنا دونوں برابر ہیں اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر فرق ہے تو صرف اس قدر کہ کوئی شخص مجبوری کی حالت میں بھیک مانگ سکتا ہے۔ مگر جہیز یا جوڑا گھوڑا مانگنا کسی بھی حال میں جائز نہیں ہوسکتا۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ جو لوگ بھیک مانگنے سے شرماتے ہیں وہ بلا تکلف لڑکی والوں سے فرمائشی جہیز کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں جو بغیر کسی ''عوض'' کے ہونے کی بنا پر بھیک کی ایک نئی قسم ہے جو شرعی اعتبار سے ''مال باطل'' کے ذیل میں آتی ہے۔ اس کی تفصیل پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے۔ مگر اس قسم کے مطالبہ میں لوگوں کو کسی قسم کا عار محسوس نہیں ہوتا بلکہ وہ سینہ تان کر اور پوری ڈھٹائی کے ساتھ اس کا مطالبہ کرتے ہیں اور اس قسم کے مطالبات میں آج بہت سے متشرع قسم کے (یعنی دیندار) لوگ بھی پیش پیش دکھائی دیتے ہیں۔ گویا کہ ان کے دلوں سے خوف خدا اور خوف آخرت پوری طرح نکل چکا ہے۔

یہ صورت حال بہت ہی افسوسناک ہے اور بیرومیٹر ایک خطرناک طوفان کی خبر دے رہا ہے۔ اگر حامیان دین نے فوراً ہی اس کا نوٹس نہیں لیا تو پھر آنے والا طوفان ایک بہت بڑی تباہی لائے گا اور انسانیت کا جنازہ نکل جائے گا۔

بہر حال اس موقع پر چند ایسی حدیثیں پیش کی جاتی ہیں جن کے ملاحظہ سے اس حقیقت پر روشنی پڑے گی کہ اسلامی شریعت میں کسی شخص کے لئے مانگنا کب جائز ہوسکتا ہے اور اس کے حدود وضوابط کیا ہیں؟ یہ حدیثیں اگرچہ زکوۃ کے باب میں وارد ہوئی ہیں مگر اس سے زیر بحث مسئلے کو سمجھنے میں بہت زیادہ مدد مل سکتی ہے۔

اسلامی شریعت میں بھیک مانگنا صرف اسی وقت جائز ہوسکتا ہے جب کہ کوئی شخص نان شبینہ تک کا محتاج ہو۔ چنانچہ زکوۃ کے مسائل میں بعض حدیثوں میں صراحت موجود ہے

کہ کسی غنی (صاحب نصاب) اور تندرست شخص کے لئے صدقہ (زکوۃ) مانگنا جائز نہیں ہے اور بعض حدیثوں میں مانگنے کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ مثلاً

لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ وَلَا لِذِيْ مِرَّةٍ سَوِيٍّ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ مانگنا کسی مالدار شخص اور تندرست وتوانا آدمی کے لئے جائز نہیں ہے۔ (سنن ابوداؤد، جلد دوم صفحہ 286، جامع ترمذی جلد سوم صفحہ 42)

مَنْ سَأَلَ النَّاسَ وَلَهُ مَا يُغْنِيْهِ جَاءَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ مَسْأَلَتُهُ فِيْ وَجْهِهٖ خُمُوْش "أَوْ خُدُوْش" أَوْ كُدُوْح: رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ جو شخص لوگوں سے سوال کرے جب کہ اس کے پاس بقدر کفایت مال موجود ہو تو قیامت کے دن اس کے سوال کے سبب سے اس کا چہرہ چھلا ہوا ہوگا۔ (سنن ابوداؤد جلد دوم صفحہ 277، جامع ترمذی کتاب الزکوۃ جلد سوم صفحہ 41)

اِنَّ الْمَسْأَلَةَ لَا تَحِلُّ لِغَنِيٍّ وَلَا لِذِيْ مِرَّةٍ سَوِيٍّ اِلَّا لِذِيْ فَقْرٍ مُدْقِعٍ أَوْ غُرْمٍ مُفْظِعٍ وَ مَنْ سَأَلَ النَّاسَ لِيُثْرِيَ بِهٖ مَالَهُ كَانَ خُمُوْشًا فِيْ وَجْهِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ رَضْفًا يَأْكُلُهُ مِنْ جَهَنَّمَ وَ مَنْ شَاءَ فَلْيُقِلَّ وَ مَنْ شَاءَ فَلْيُكْثِرْ: رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ سوال کرنا کسی مالدار یا تندرست شخص کے لئے حلال نہیں ہے، سوائے اس شخص کے جو سخت محتاج یا بہت زیادہ مقروض ہو لیکن جو شخص اپنی دولت بڑھانے کے لئے سوال کرے گا تو قیامت کے دن اس کا سوال اس کے چہرے پر خراش کی صورت میں نمودار ہوگا اور دوزخ کے گرم پتھر اس کو کھائیں گے۔ اب جس کا جی چاہے مال کو کم کرے۔ (غریب بنے) یا زیادہ کر لے۔ (بتکلف امیر بننے کی کوشش کرے) (جامع ترمذی جلد سوم صفحہ 43)

لَا تَزَالُ الْمَسْأَلَةُ بِأَحَدِكُمْ حَتّٰى يَلْقَى اللّٰهَ وَ لَيْسَ فِيْ وَجْهِهٖ مُزْعَةُ لَحْمٍ: رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص لوگوں سے ہمیشہ مانگتا رہے گا یہاں تک کہ وہ (حشر کے دن) اللہ سے ملے گا اور اس کے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا۔ (یعنی وہ ذلیل وخوار ہو کر اللہ کے پاس جائے گا)۔ (صحیح مسلم کتاب الزکوۃ جلد دوم صفحہ 720)

مَنْ سَأَلَ النَّاسَ اَمْوَالَهُمْ تَكَثُّراً، فَاِنَّمَا يَسْأَلُ جَمْراً، فَلْيَسْتَقِلَّ اَوْلِيَسْتَكْثِرْ: جو شخص لوگوں سے محض اپنا مال بڑھانے کے لئے مانگتا رہتا ہے، وہ دراصل (جہنم کی) آگ مانگتا ہے، چاہے کم لے یا زیادہ۔ (صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ جلد دوم صفحہ 720)

ان تمام حدیثوں سے مقصود اسلامی شریعت میں مانگنے کی مذمت اور برائی ہے۔ ایک تندرست و توانا آدمی اور بقدر ضرورت مال رکھنے والے شخص کے لئے مانگنا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ کسی کے پاس نان شبینہ (ایک وقت کا کھانا) تک موجود نہ ہو۔ جیسا کہ ایک حدیث میں اس کی صراحت اس طرح کی گئی ہے۔

مَنْ سَأَلَ مَسْأَلَةً عَنْ ظَهْرِ غِنىً اسْتَكْثَرَ بِهَا مِنْ رَضْفِ جَهَنَّمَ. قَالُوْ يَا رَسُوْلَ اللهِ وَ مَاظَهْرُ الْغِنٰى؟ قَالَ عَشَاءُ لَيْلَةٍ: جس شخص نے قدر حاجت موجود ہونے کے باوجود کوئی سوال کیا تو گویا کہ اس نے جہنم کے گرم پتھروں کو جمع کرنے میں زیادتی کی۔ صحابہ نے پوچھا کہ قدر حاجت سے مراد کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ نان شبینہ۔ (سنن دار قطنی جلد دوم صفحہ 121)

ایک دوسری روایت میں "ایک دن اور رات کے کھانے" کے الفاظ موجود ہیں۔ (تفسیر قرطبی جلد ہشتم صفحہ 174)

اور بعض روایات میں پچاس درہم کے الفاظ ملتے ہیں۔ (سنن ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ جلد دوم صفحہ 278)

تو اس کا حاصل یہ ہے کہ جس شخص کے پاس اتنی سی چیز بھی موجود ہو اس کے لئے مانگنا جائز نہیں ہے۔

یہ حدیثیں زکوٰۃ یا صدقہ کے بارے میں مروی ہیں کہ کسی شخص کو مانگنا کب جائز ہو سکتا ہے؟ تو اسلامی شریعت کی رو سے کسی شخص کے لئے مانگنا سخت مجبوری کی حالت میں جائز اور روا رکھا گیا ہے جب کہ کسی کے پاس ایک وقت کا کھانا بھی موجود نہ ہو۔ یہ افضل ترین درجہ ہے اور پچاس درہم والی حدیث کو غیر افضل پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اب رہا معاملہ فرمائشی جہیز وغیرہ کا تو وہ ان حدیثوں کی رو سے بالکل ناجائز اور حرام ہے کیونکہ یہ مطالبہ عموماً

کھاتے پیتے اور مالدار لوگ ہی کرتے ہیں اور جو لوگ اس طرح ناجائز طریقوں سے مال حاصل کرتے ہیں وہ مذکورہ بالا حدیثوں کے مطابق اپنے پیٹوں میں دوزخ کی آگ بھرتے ہیں اور اللہ کے غیض و غضب کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ نیز اس سلسلے میں ایک اور حدیث سے مزید روشنی پڑتی ہے کہ مانگنا صرف تین صورتوں میں جائز ہو سکتا ہے اور ان تین صورتوں کے علاوہ کسی اور وجہ سے مانگنا حرام ہے اور اس میں جہیز اور جوڑے گھوڑے کا مطالبہ بھی شامل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ فرمائشی جہیز مانگنے یا کسی اور چیز کا مطالبہ کرنے والوں کو یہ حدیث کان کھول کر سن لینی چاہئے کیونکہ یہ مانگنے کی مذمت اور برائی میں آخری درجے کی چیز ہے۔

ایک صحابی قبیصہ بن مخارق بیان کرتے ہیں کہ میں ایک بڑی رقم کا قرضدار ہو گیا تھا تو رسول اللہ صلعم کے پاس آیا اور آپ سے سوال کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ذرا ٹھہر جاؤ۔ اگر صدقہ (زکوٰۃ) کا مال آ جائے تو ہم تمہیں کچھ دے دیں گے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اے قبیصہ! دیکھو سوال کرنا صرف تین آدمیوں کے لئے جائز ہو سکتا ہے۔ ایک وہ شخص جو (کسی کار خیر میں) قرضدار ہو جائے تو اس کے لئے سوال کرنا جائز ہے۔ وہ اپنے قرض کی تلافی ہونے کے بعد رک جائے۔ دوسرا وہ شخص جس کا مال کسی آفت کی بنا پر ضائع ہو گیا ہو، تو اس کے لئے مانگنا جائز ہے یہاں تک کہ اس کی معیشت درست ہو جائے۔ تیسرا وہ شخص جو فاقہ کشی کر رہا ہو اور اس کی قوم کے تین صاحب عقل لوگ اس کی فاقہ کشی کی گواہی دیں۔ تو اس کے لئے بھی مانگنا درست ہے۔ یہاں تک کہ اس کی حالت درست ہو جائے۔ تو اے قبیصہ! ان تین آدمیوں کے ماسوا سوال کرنا حرام ہے اور سوال کرنے والا حرام کھاتا ہے۔ (صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ جلد دوم صفحہ 722)

یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے جس میں مانگنے کے حدود و آداب بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے ان قسموں کے علاوہ جو بھی مطالبہ ہوگا وہ حرام ہوگا۔ خواہ وہ جہیز ہو یا کچھ اور۔ یہ اسلامی شریعت کا ایک اعجاز ہے کہ اس کے وسیع اور عمومی کلیات میں ہر دور کے مسائل کا حل مل سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن اور حدیث کے نصوص میں ہر دور کے تقاضوں کے پیش نظر تمام مسائل کا احاطہ کر دیا گیا ہے۔ اسی بنا پر فرمایا گیا ہے کہ اسلامی قانون سے صرف نظر

کر کے دیگر قوانین اور رسوم کی طرف توجہ کرنا قانون جاہلیت کو اپنانا ہے۔

وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَ هُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (سورۃ آل عمران 3 آیت 85) اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین چاہے گا وہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھائے گا۔

إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ: (سورۃ آل عمران آیت 19) اللہ کے نزدیک (پسندیدہ) دین صرف اسلام ہے۔ کیونکہ وہ ہر حیثیت سے کامل و مکمل، محکم و متوازن، جامع و بے عیب اور ابدی و سرمدی ہے۔ ایک ایسا محکم و متوازن قانون جس کا نظارہ چشم انسانی نے اب تک نہیں کیا ہے۔ جو ہر قسم کے تغیر اور کمی بیشی سے پاک ہر دور اور ہر زمانے میں پوری نوع انسانی کی ہدایت و رہنمائی کر سکتا ہے۔

اسلام میں کسب کی اہمیت

غرض اسلامی شریعت ہر اعتبار سے ایک معقول اور متوازن شریعت ہے۔ چنانچہ اس میں مانگنے کی برائی و ہمت شکنی اس لئے کی گئی ہے کیونکہ ایک تندرست و توانا شخص کے لئے زندگی کے میدان میں بذات خود جدوجہد کرنا اور ہاتھ پیر چلانا ضروری ہے۔ ورنہ لوگ کاہلوں اور اپاہجوں کی طرح دوسروں کے محتاج اور دست نگر بن کر زندگی گزارنے کو ترجیح دینے لگیں گے اور یہ بات شرعی و اخلاقی دونوں اعتبار سے معیوب ہے، جو فساد تمدن کا باعث ہے، اسی بنا پر رسولؐ نے بیکاری کی زندگی گزارنے اور دوسروں پر بوجھ بننے کو ناپسند کرتے ہوئے کوئی نہ کوئی پیشہ اختیار کرنے اور محنت و مشقت سے روزی کمانے پر ابھارا ہے۔ چنانچہ آپ نے اس سلسلے میں جنگل سے لکڑیاں لا کر بیچنے کو مانگنے کی بہ نسبت بہتر بات اور شریفانہ پیشہ قرار دیا ہے۔

لَأَنْ يَّحْتَزِمَ أَحَدُكُمْ حُزْمَةً مِنْ حَطَبٍ فَيَحْمِلَهَا عَلٰى ظَهْرِهِ فَيَبِيْعُهَا خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَّسْأَلَ رَجُلًا يُعْطِيْهِ أَمْ يَمْنَعُهُ: رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص لکڑیوں کا گٹھا (جنگل سے) اپنی پیٹھ پر لاد کر لائے اور اسے بیچ کر (گزر معاش کرے) تو بات اس کے حق میں کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بہتر ہے، جو

چاہے تو دے یا نہ دے۔ (صحیح مسلم کتاب الزکوۃ جلد دوم صفحہ 721)

اللہ نے انسان کو ہاتھ پیر اس لئے نہیں دیئے کہ وہ کاہلوں اور اپاہجوں کی طرح زندگی گزارے بلکہ اس لئے دیئے ہیں کہ وہ زندگی کے میدان میں جدوجہد کر کے اپنے پیروں پر خود کھڑا ہو اور اپنے اہل و عیال کی خبر گیری کر کے ان کے حقوق پوری طرح ادا کرے۔ انسان جو مال محنت و مشقت سے کماتا ہے اس کی وہ قدر کرتا ہے اور اسے اپنے متعلقین پر صرف ایک روحانی لذت و مسرت حاصل کرتا ہے۔ اس کے برعکس مفت میں آئی ہوئی دولت کی قدر دانی نہیں ہوتی اور نہ اس میں خیر و برکت ہوتی ہے۔ بہر حال اسلام میں محنت و مشقت سے کمانے اور خرچ کرنے والوں کی بڑی فضیلت آئی ہے جب کہ ان کے مقابلے میں مانگنے اور صدقہ و خیرات قبول کرنے والوں کو کمتر اور دوسرے درجے کے لوگ قرار دیا گیا ہے، اگر چہ وہ استحقاق ہی کی بنیاد پر ہو۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے۔

اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلٰى، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ. وَ خَيْرُ الصَّدَقَةِ عَنْ ظَهْرِ غِنًى. وَ مَنْ يَّسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللّٰهُ. وَ مَنْ يَّسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللّٰهُ: اوپر کا ہاتھ (دینے والا) نیچے کے ہاتھ (لینے والے) سے بہتر ہے۔ خیرات کی ابتدا اپنے اہل و عیال سے کرو۔ بہتر خیرات وہ ہے جسے دے کر آدمی کنگال نہ ہو جائے۔ جو سوال کرنے سے بچے گا تو اللہ اسے بچائے گا۔ اور جو بے نیاز رہے گا تو اللہ اسے بے نیاز بنا دے گا۔ (صحیح بخاری کتاب الزکوۃ)

یہ اسلام کی بہترین تعلیمات میں سے ہے بلکہ یہ دراصل قیمتی اصولوں کا ایک گلدستہ ہے جو انسانی ذہن کی تعمیر اور اس کی ذہن سازی میں نہایت درجہ اہمیت کا حامل ہے۔ ان ابدی تعلیمات کی روشنی میں جہیز اور جوڑے گھوڑے کا مطالبہ کرنے والے غور کریں کہ ان کے مطالبات کی شرعی حیثیت کیا ہے اور اس کا جواز کہاں تک نکل سکتا ہے۔ مال و متاع دو دن کی عیاشی ہے اور اس کے مقابلے میں اللہ کی ناراضگی مول لینا اور چند سکوں کے لئے دین و آخرت کا سودا کر کے ابدی زندگی کو ٹھوکر مار دینا کیا کوئی دانشمندانہ فعل ہو سکتا ہے؟ یہ طالبان جہیز کے لئے ایک لمحہ فکریہ ہے۔ ایک طرف روپے پیسے کی ریل پیل اور سکوں کی جھنکار ہے اور دوسری طرف حیات جاودانی ہے اب ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ ان دونوں میں

سے جس چیز کو چاہے اپنے لئے پسند کرے۔

اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا: ہم نے انسان کو (اصل) راستہ یقیناً دکھادیا ہے۔ اب وہ اس (رات کو بھی دکھادیا) چاہے تو شکر گزار بنے یا ناشکرا۔ (سورۃ دہر 76، آیت 3)

عصر حاضر کا سب سے بڑا منکر اور امت مسلمہ کا فریضہ

مذکورۂ بالا مباحث سے اسلامی شریعت کی خوبی اور اس کی معجزانہ جامعیت کا پتہ چلتا ہے کہ اس میں کتنی دقت نظر سے ہر چیز کا احاطہ کرنے کی صلاحیت رکھی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی شریعت میں انفرادی و اجتماعی حیثیت سے انسان کی تمام ضرورتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ جن کا استنباط کرنا علمائے اسلام کا کام ہے۔ عقلی وفطری اعتبار سے جو چیزیں انسانی معاشرت وتمدن کے لئے مضر اور نقصان دہ ہوسکتی ہیں وہ شرعی اعتبار سے بھی ناپسندیدہ ہوں گی۔ کیونکہ اسلام اور اسلامی شریعت موافق عقل وفطرت ہیں۔ اس قسم کی چیزوں کو اسلامی اصطلاح میں "منکرات" کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ امور جو عقلی و شرعی اعتبار سے ناپسندیدہ ہوں۔ اس کے برعکس جو چیز پسندیدہ ہوگی وہ معروف کہلائے گی۔

بہر حال موجودہ رواج کے مطابق جہیز اور جوڑے گھوڑے کی رسم ایک غیر شرعی رسم ہے جو اسلامی شریعت کے خلاف ہونے کی وجہ سے ایک "منکر" کا درجہ رکھتی ہے۔ یعنی ایسا ناپسندیدہ فعل جس سے نہ صرف خود اجتناب کرنا ضروری ہے بلکہ معاشرہ کے دوسرے افراد کو بھی اس سے روکنا ضروری ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جگہ جگہ امت مسلمہ کی تعریف و توصیف میں اس کی جو خصوصیات گنائی گئی ہیں ان میں سے ایک معروف (پسندیدہ بات) کی تبلیغ اور منکر (ناپسندیدہ چیز) سے اجتناب بھی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ یَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَیْرِ وَ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (سورۃ آل عمران 3 آیت 104) تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو لوگوں کو خیر کی طرف بلائے اور انہیں معروف کا حکم کرے اور منکر سے باز رکھے۔

شریعت کی دو جامع اصطلاحات

معروف اور منکر دو جامع اصطلاحات ہیں۔ لفظ معروف میں جس طرح ہر قسم کی اخلاقی (اعتقادی، معاشرتی، نظریاتی اور سیاسی اعتبار سے) خوبیاں داخل ہوسکتی ہیں، اسی طرح لفظ منکر میں ہر قسم کی اعتقادی، معاشرتی، تمدنی وسیاسی برائیاں جو عقلی واخلاقی اعتبار سے مضر اور تباہ کن ہوسکتی ہیں سب شامل ہوسکتی ہیں۔ منکر اصل میں مجہول یا امر ناشناس (نا پہچانی ہوئی چیز) کے ہیں۔ یعنی جو عقلاً ناپسندیدہ ہوا اور پچھلے مباحث سے بخوبی واضح ہوچکا ہے کہ فرمائشی جہیز اور جوڑے گھوڑے کا مطالبہ عقلاً ایک امر ناشناس اور ناپسندیدہ مطالبہ ہے کیونکہ ایک تو یہ ایک غیر شرعی مطالبہ اور پھر وہ فساد تمدن کا باعث ہے۔ لہٰذا اس اعتبار سے یہ موجودہ دور کا سب سے بڑا منکر ہے جو اپنے اثرات بد کی بنا پر نہ صرف مختلف خاندانوں کو تباہ کررہا ہے بلکہ پورا معاشرہ اس کی زد اور لپیٹ میں آکر منتشر و پراگندہ ہورہا ہے اس اعتبار سے اگر اس کو منکرات میں شامل نہ کیا جائے تو پھر میں نہیں سمجھتا کہ پھر کون سی چیز منکر ہوسکتی ہے؟ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ فعل ناجائز منکر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑا سماجی ظلم وزیادتی بھی ہے، جس سے باز آنے کی تاکید اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام ابدی میں ایک جامع کلیہ کی شکل میں اس طرح کی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰى وَ یَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْیِ (سورۃ نحل 16 آیت 90) اور (ہر معاملے میں) اعتدال، بھلائی اور رشتہ داروں کو دینے کا حکم کرتا ہے اور بے حیائی، بری بات اور زیادتی سے منع کرتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں تین باتوں کا حکم دیا گیا ہے اور تین باتوں سے منع کیا گیا ہے، جن میں ہر قسم کی اخلاقی خوبیاں اور خرابیاں شامل ہوسکتی ہیں، تو یہاں پر جن تین باتوں سے منع کیا گیا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کا انطباق جوڑے گھوڑے اور جہیز کے مطالبات پر بآسانی ہوسکتا ہے۔ یہ مطالبات بری بات (منکر) اور ظلم وزیادتی (بغی) تو ہیں ہی مگر وہ بعض صورتوں میں بے حیائی (فحشاء) کی حدوں کو چھوتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ لہٰذا

اگر مسلمان ان ناجائز مطالبات سے باز نہیں آئیں گے تو پھر انہیں غضب الٰہی اور اپنی تباہی و بربادی کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

دنیا کا نجات دہندہ

آقائے نامدار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پوری دنیا کے لئے رحمت بن کر آئے تھے۔ چنانچہ قرآن میں آپ کو "رَحْمَةً" لِلْعٰلَمِيْنَ " (سورۃ انبیاء 21 آیت 107) کے خطاب سے نوازا گیا ہے۔ آپ کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ تھی کہ آپ ساری دنیائے انسانیت کے نجات دہندہ تھے۔ یعنی آپ کو بعثت کے وقت دنیا جن بوجھل قسم کی سماجی زنجیروں میں جکڑی ہوئی بلبلا رہی تھی اور جن غیر ضروری بندھنوں کے بوجھ سے کراہ رہی تھی ان سے گلوخلاصی بھی بعثت محمدی کے مقاصد میں ایک اہم مقصد تھا۔ جیسا کہ قرآن حکیم اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (سورۃ اعراف 7 آیت 157) وہ لوگ جو اس رسول کی پیروی کرتے ہیں اور جو نبی امی ہے اور جسے اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ ان کو معروف کا حکم کرتا ہے اور منکر سے روکتا ہے اور ان کے لئے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور قیدیں اتارتا ہے جو ان پر (سماجی اعتبار سے چلی آ رہی) تھیں۔

پاک اور ناپاک چیزیں

معروف اور منکر میں جیسا کہ تفصیل گزر چکی ہر قسم کی اخلاقی خوبیاں اور خرابیاں سب کچھ شامل ہیں مگر اس موقع پر خاص کر "طیبات" میں ہر قسم کی حلال چیزیں اور حلال پیشے وغیرہ سب کچھ آ جاتے ہیں۔ اسی طرح "خبائث" کے لفظ میں ہر قسم کی ناپاک و ناجائز چیزیں، پیشے

اور طور طریقے وغیرہ سب کچھ شامل ہو سکتے ہیں۔ ان دو الفاظ کا اطلاق خاص کر کھانے پینے کی چیزوں پر ہوتا ہے۔ "اصر" اور "اغلال" کا اطلاق خاص کر معاشرتی و تمدنی امور پر ہوتا ہے۔ یعنی وہ غلط رسوم و رواجات جو زمانہ قدیم سے مختلف تہذیبوں میں چلے آ رہے تھے اور خاص کر یہود و نصاریٰ کے یہاں رائج ہو گئے تھے۔ ان تمام کو دور کر کے اور انہیں یکلخت منسوخ کر کے پوری نوع انسانی کو نجات دلانا بعثت محمدی کا ایک اہم ترین مقصد تھا۔

منکرات کو نہ مٹانے کا انجام

اس اعتبار سے غیر شرعی و غیر عقلی رسوم و رواجات اور جاہلی تمدن و خرافات سے نہ صرف اجتناب کرنا بلکہ ان خرافات سے پوری نوع انسانی کو نجات دلانا امت اسلامیہ کا فریضہ ہے کہ وہ موجودہ بوجھل سماجی زنجیروں کو کاٹ کر کراہتی ہوئی انسانیت کو امن و سلامتی اور چین و سکون سے روشناس کرائیں۔ مگر یہ کتنی بڑی عبرت کی بات ہے کہ آج اس سماجی ظلم میں مسلمان بھی برابر کے شریک نظر آ رہے ہین۔ بجائے اس کے وہ ظالم سماج کی کلائی مروڑ دیتے ہیں خود ہی اس لوٹ مار میں شریک ہو کر منکرات کو فروغ دینے میں لگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اہل اسلام کا منصب سماجی لوٹ مار اور فواحش و منکرات کا فروغ نہیں بلکہ سماجی ظلم و ستم کے خلاف جہاد اور فواحش و منکرات کا مقابلہ اور ان کا استیصال ہے۔ اگر وہ اپنے اس فرض منصبی سے غافل ہو گئے تو پھر پوری زمین فساد سے بھر جائے گی اور ایک ہمہ گیر تباہی آئے گی جس کی لپیٹ میں ہر ادنیٰ و اعلیٰ سب آ جائے گا اور کوئی بھی بچ نہیں سکے گا۔ چنانچہ حسب ذیل آیات کریمہ اس سلسلے میں اٹل الٰہی فیصلہ اور تازیانہ عبرت کی حیثیت رکھتی ہیں۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَاۤ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ (سورۃ ہود 11 آیت 116 سے 117) تو جو امتیں تم سے پہلے گزری ہیں ان میں ایسے سمجھدار لوگ کیوں نہ ہوئے جو دوسروں کو زمین میں فساد برپا کرنے سے منع کرتے؟ بجز چند آدمیوں کے جنہیں ہم نے (عذاب عام سے) بچا لیا تھا اور جو لوگ

نافرمان تھے وہ جس ناز و نعمت میں تھے وہ اسی کے پیچھے پڑ کر جرائم کے خوگر ہو گئے اور تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ آبادیوں کو بلاوجہ تباہ کر دے جب کہ وہاں کے لوگ اصلاح پسند ہوں۔

ایک دوسرے مقام پر اس اصول کی تشریح اس طرح کی گئی ہے۔

وَ مَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرىٰ اِلَّا وَ اَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ (سورۃ قصص 28 آیت 59) اور ہم بستیوں کو ہلاک نہیں کرتے مگر اس وقت جب کہ وہاں کے باشندے ظالم بن جائیں۔

اہل اسلام کا فرض منصبی

حاصل یہ کہ لفظ جہیز اگر چہ لفظی اعتبار سے قرآن میں (اس کے مروجہ معنوں میں) موجود نہیں ہے مگر اصولی و معنوی اعتبار سے اس کا تذکرہ ضرور موجود ہے۔ چنانچہ اوپر قرآن کے جن اصول و کلیات کا تذکرہ ہو چکا ہے ان میں جہیز ایک سماجی منکر کی حیثیت سے شامل ہو سکتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کے خلاف جہاد کرنا اہل اسلام کا فرض منصبی ہے جو ایک نظریاتی ملت ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے۔

مَنْ رَاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ، فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ، فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَ ذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ: تم میں سے جو کوئی کسی بری بات کو دیکھے تو چاہئے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے۔ اگر اس کی طاقت نہ ہو تو پھر (کم از کم) زبان ہی سے اس کی مذمت کرے اور اگر (مخالفانہ ماحول کی وجہ سے) اس کی بھی طاقت نہ ہو تو پھر دل میں اس چیز کو برا جانے۔ اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔ (صحیح مسلم، کتاب الایمان)

یہ ایمان کے تین درجوں کا بیان ہے۔ جن میں سب سے اعلیٰ ترین درجہ برائی (منکر) کو ہٹانا ہے نہ کہ الٹا اسے فروغ دینا۔ مگر جو لوگ ان میں سے کسی ایک درجے میں بھی شامل نہ ہوں وہ سرے سے مومن و مسلم نہیں ہو سکتے۔ العیاذ باللہ۔ لہٰذا ہر مسلمان کو کوشش کرنی چاہئے کہ وہ ایمان کے اعلیٰ اور سب سے اونچے درجے پر پہنچنے کی کوشش کرے۔ یعنی سماجی برائیوں کو اپنے ہاتھ سے مٹانے کی یا کم از کم زبان کے ذریعے جہاد کرنے کی کوشش کرے۔

جب تک مسلمان اس میدان میں نہیں آئیں گے سماجی برائیوں کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہی خیر امت ہیں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (سورۃ آل عمران 3 آیت 110) تم بہترین امت ہو جو نوع انسانی کے لئے نکالی گئی ہے۔ تمہارا منصب یہ ہے کہ تم معروف کا حکم کرو اور منکر سے لوگوں کو باز رکھو۔

اس قسم کی آیات محض قرآن مجید کی زینت بڑھانے کے لئے نہیں ہیں بلکہ ان کا نفاذ ہماری عملی زندگیوں میں ہونا چاہئے اور جب تک ہم ان خدائی احکام پر عمل نہ کریں ہماری فکری و عملی زندگی میں کوئی انقلاب نہیں آ سکتا اور ہمارا بنیادی نصب العین قانون جاہلیت کے خلاف اعلان جنگ ہونا چاہئے۔ ورنہ ہم "خیر امت" کہلانے کے اہل نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے امت اسلامیہ کو ایک بہت بڑے خطاب سے نوازا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس خطاب کی لاج رکھنی چاہئے۔ ورنہ اقوام عالم میں ہمارا سر اونچا نہیں ہو سکتا۔

خلاق عالم کا سب سے انمول تحفہ

واقعہ یہ ہے کہ عورت خلاق عالم کا نرالا اور حسین ترین تخلیقی شاہکار ہے۔ وہ انسان کے لئے قدرت کا سب سے زیادہ قیمتی عطیہ ہے، جو انس و محبت اور غمخواری کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ دن بھر کی جدوجہد کے بعد ایک تھکا ہوا شخص جب شام کو گھر لوٹتا ہے تو ایک وفا شعار اور خوش مزاج بیوی کی مسکراہٹوں کا استقبال اس کی ساری تھکاوٹ اور غموں کو دور کر دیتا ہے۔ وہ طبیعت میں فرحت و نشاط محسوس کرتا ہے۔ بیوی اسے ایک روحانی سکون اور تازگی بخشتی ہے اور دونوں باہمی ہمدردی و غمخواری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کے دکھوں کو سمجھنے اور انہیں خوش اسلوبی سے دور کر کے اپنی زندگی کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

قرآن کی گواہی

چنانچہ قرآن مجید میں عورت کی تخلیق کا بنیادی مقصد یہی بتایا گیا ہے۔

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَ

جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَّ رَحْمَةً (سورۃ روم 30 آیت 21) اور اللہ کی نشانیوں میں سے ہے یہ بات کہ اس نے تمہارے لئے تم ہی میں سے بیویاں بنائیں تا کہ تم ان سے سکون حاصل کر سکو اور اس نے تمہارے درمیان آپسی محبت اور مہربانی بھی رکھ دی (تا کہ تم اپنی زندگی کو خوشگوار بنا سکو)

یہی وہ سکون قلب اور الفت باہمی ہے جس کے باعث نہ صرف ایک خاندان کی بنیاد پڑتی ہے بلکہ تمدن انسانی کی گاڑی بھی رواں دواں رہتی ہے اسی سکون قلب کی خاطر ایک مرد بڑی سے بڑی قیمت تک ادا کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے بلکہ وہ آسمان کے تارے تک توڑ کر لانے اور انہیں اپنی شریک حیات کے قدموں میں نچھاور کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔

زندگی جنت بھی جہنم بھی

غرض خلاق عالم کے اس سب سے زیادہ قیمتی اور نادر و نایاب تحفے کی صحیح قدردانی کے باعث زندگی پر بہار اور مسرت آگیں بن جاتی ہے۔ جس طرح کہ اس خدائی عطیہ کی ناقدری کے باعث زندگی جہنم زار ہو جاتی ہے، مگر جہاں تک موجودہ دور کا سوال ہے، اس میں زندگی کی قدریں بدل گئی ہیں۔ چنانچہ اب زندگی کو بجائے خوشگوار اور سکون قلب کا ذریعہ بنانے کے خود غرضی اور تجارت کا ذریعہ بنا لیا گیا ہے۔ میری مراد جہیز کے غلط، مصنوعی، خود غرضانہ اور خوفناک طور طریقوں سے ہے، جن کے باعث آج نہ صرف خاندانوں کے خاندان تباہ اور برباد ہو رہے ہیں بلکہ اس کی وجہ سے مختلف خاندانوں کے درمیان نفرت، دشمنی اور باہمی عداوت کی بنیادیں بھی پڑ رہی ہیں، جو معاشرتی لحاظ سے ایک تباہ کن چیز ہے۔ شادی بیاہ کا مقصد دو دلوں کو جوڑنا اور ایک نیا گھر بسانا ہوتا ہے۔ مگر آج جہیز اور جوڑے گھوڑے کے غلط رسم و رواج کی بنا پر بجائے دلوں کو جوڑنے کے انہیں توڑا جاتا ہے اور بجائے سچی اور اصلی خوشیاں حاصل کرنے کے چند سکوں کی خاطر نفرت و عداوت کے بیج بوئے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے زندگی کے مقصد کو بھلا دیا ہے اور اصل مقصد کو فراموش کر کے چند مصنوعی اور بناوٹی قدروں کو اپنا لیا ہے۔ جس کے نتیجے میں ہم نہ صرف

غضب الٰہی کو دعوت دے رہے ہیں بلکہ اپنی قبریں خود اپنے ہاتھوں کھود رہے ہیں۔

قانون فطرت کی خلاف ورزی

اللہ تعالیٰ نے دنیا کے اکثر و بیشتر جانداروں کو جوڑے جوڑے بنا کر پیدا کیا ہے۔ اس طرح پورا کارخانہ فطرت "زوجیت" کی بنیاد پر چل رہا ہے۔ مگر جہاں تک خود غرضی کا سوال ہے تو وہ سوائے انسانوں کے اور کسی طبقے میں نہیں پائی جاتی۔ انسان اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود انتہائی خود غرض اور مفاد پرست بن کر نہ صرف اپنا سکون برباد کر رہا ہے بلکہ اپنی موت کو آپ دعوت دے رہا ہے۔ چنانچہ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جس میں اخبارات کے ذریعے جہیز کی وارداتوں (جلائے جانے یا گلا گھونٹ کر مارے جانے) کی اطلاع نہ ملتی ہو۔ ظاہر ہے کہ معصوم جانوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے کے بعد ان کو چین و سکون کبھی حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ انہیں اس کے برعکس رسوائی اور جگ ہنسائی ہی نصیب ہو سکتی ہے کیونکہ ایسے لوگ قانون اور معاشرہ دونوں کی نظر میں معتوب اور مستوجب سزا قرار پا چکے ہیں۔ یہ سب بے جا لالچ اور خود غرضی کا لازمی نتیجہ ہے۔

دنیا کا سب سے قیمتی سرمایہ

قرآن میں جہاں پر اللہ رحمان کے بندوں (عباد الرحمان) کی چند صفات بیان کرتے ہوئے ان کی تعریف و توصیف کی گئی ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے لئے اللہ سے نیک سیرت بیویاں اور نیک اولاد طلب کرتے رہیں۔

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا (سورۃ فرقان 24 آیت 74) اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں متقی لوگوں کا پیشوا بنا۔

گویا یہ اہل اسلام کو اللہ رحمان کی جانب سے ایک تلقین ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی شریک حیات کے انتخاب میں اس پہلو کو ضرور مدنظر رکھیں۔ ظاہر ہے کہ نیک سیرتی ہی کی بنا پر میاں

بیوی خوش وخرم رہ سکتے ہیں اور یہی وہ سچی اور حقیقی خوشی ومسرت ہے جو "آنکھوں کی ٹھنڈک" بن سکتی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث شریف میں اس خدائی اصول کی شرح وتفصیل اس طرح کی گئی ہے۔ "کسی عورت سے نکاح چار باتوں کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ (1) مال کی وجہ سے، (2) خاندان کی وجہ سے، (3) خوبصورتی کی وجہ سے، (4) اس کی دینداری کی وجہ سے۔ پھر فرمایا کہ تم دین دار عورت سے نکاح کرو۔" (صحیح بخاری)

اس کی مزید شرح ایک دوسری حدیث میں اس طرح مذکور ہے: "تم عورتوں سے ان کے حسن کی وجہ سے نکاح مت کرو، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ان کا حسن انہیں تکبر میں مبتلا کرکے ہلاک کردے اور ان سے مال ودولت کی بناپر بھی نکاح مت کرو کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ان کا مال ودولت انہیں سرکش بنادے لیکن تم دین داری کی بناپر ان سے نکاح کرو، ایک نکٹی اور کالی کلوٹی باندی بھی بہتر ہے جب کہ وہ دیندار ہو۔" (سنن ابن ماجہ)

"ایک نیک سیرت بیوی دنیا کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہے۔" (مسلم ونسائی) لہٰذا وہ شخص بڑا ہی خوش قسمت ہے جس کو ایک بااخلاق اور مونس وغمخوار شریک حیات مل جائے۔

ایک اور حدیث کے مطابق ایک نیک سیرت بیوی کی چند صفات یہ بھی ہیں۔ "جب شوہر اس کی طرف دیکھے تو وہ اسے مسرور کردے۔ جب کسی بات کا حکم کرے تو وہ بجالائے اور وہ اپنے نفس کی حفاظت اور شوہر کے مال کے بارے میں اس کی مخالفت نہ کرے، جو اسے ناپسند ہو۔" (اصحاب سنن)

ایک معاشرتی سرطان

مگر اس کے برعکس آج ہم نیک سیرت بیوی کے بجائے مالدار بیوی یا زیادہ سے زیادہ جہیز لانے والی کی تلاش میں رہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرنے سے ذرا بھی نہیں شرماتے۔ ایک غریب لڑکی جس کے پاس پیسہ نہیں ہے مگر وہ سیرت واخلاق کے لحاظ سے اعلیٰ کردار کی حامل ہے، اس کی طرف کوئی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک غلط اور غیر دانشمندانہ اصول ہے جو نہ صرف الٰہی تلقین کے خلاف ہے بلکہ وہ سچی اور حقیقی مسرت کے حصول میں بھی جارح ہے۔ اسی وجہ سے آج معاشرتی

خرابیاں عام ہوگئی ہیں اور یہ مرض سرطان کی طرح پھیلتا ہی چلا جارہا ہے۔

شادی یا تجارت

غرض موجودہ لالچی معاشرے میں دین واخلاق کے یہ سارے اصول اور تمام خوبیاں دقیانوسیت کی نشانی قرار پاچکی ہیں اور آج کا سب سے پہلا اور مقبول عام اصول یہ ہے کہ لڑکی اپنے ساتھ کتنا پیسہ اور کتنا جہیز لائے گی؟ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اب لڑکے والوں کی طرف سے باقاعدہ مطالبات ہوتے ہیں اور مول تول ہوتا ہے۔ گویا کہ شادی کیا ہوئی ایک اچھی خاصی تجارت بن گئی ہے اور اس "مارکیٹ" میں ہر شخص خود کو "نیلام" کررہا ہے اور جہاں زیادہ "بولی" بولی جاتی ہے وہاں پر وہ خود کو "فروخت" کردیتا ہے۔ گویا کہ لڑکے آج ایک طرح کے بکاؤ مال بن چکے ہیں جس کو ضرورت ہو وہ انہیں بازار سے خرید کر لائے۔ ظاہر ہے کہ اخلاقی ومعاشرتی اعتبار سے یہ ایک ذلیل حرکت ہی نہیں بلکہ مرد کی مردانگی کا سودا بھی ہے، جو بے رحمی اور ناحق کوشی کا مظہر ہونے کی وجہ سے شرعی حیثیت سے بھی ناجائز اور قابل مذمت ہے بلکہ حقیقت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ ایک بدترین قسم کا سماجی جرم ہے جو بربادی تمدن کا بھی باعث ہے اور یہ کردار وکیرکٹر "رحمان کے بندوں" کا نہیں بلکہ شیطان کے بندوں ہی کا ہوسکتا ہے۔ حاصل یہ کہ جو شخص ایک نیک خصلت بیوی کی قدر نہیں کرتا وہ "رحمان کا بندہ" ہرگز نہیں ہوسکتا اور جس معاشرے میں کردار وکیرکٹر کی کوئی اہمیت نہ ہو اور اس کے نتیجے میں شریف بہو بیٹیاں چکلوں میں بیٹھنے پر مجبور ہوجائیں تو یہ اس کے زوال وادبار کی نشانی ہوگی اور ایسے معاشرے کو اپنی تباہی کا انتظار کرنا چاہئے۔

خلاف فطرت اصول

اصل میں یہ غیر فطری اصول ہندو رسم ورواج کا نتیجہ ہے، جس کے غلط اثرات سے اب مسلم معاشرہ بھی محفوظ نہیں رہ سکا ہے۔ ہندو مذہب میں چونکہ باپ کے ترکے میں بیٹی کا کوئی حصہ نہیں تھا، اس لئے شادی کے موقع پر لڑکی کو جہیز کے نام سے خوب سج دھج اور آن بان کے ساتھ رخصت کیا جاتا تھا۔ پہلے پہل یہ رسم صرف ہندو فرقے کے اونچے طبقے ہی

تک محدود تھی۔ مگر آج اس کی جڑیں پورے ہندو معاشرے میں پیوست ہو چکی ہیں اور اس طرح اب پورا معاشرہ لالچی بنتا جا رہا ہے اور اس لالچ نے آج ایک سماجی لعنت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ چنانچہ اب ہر سال ہندوستان میں ہزاروں عورتیں جہیز کے لالچ میں گلا گھونٹ کر یا زیادہ جلا کر ماردی جاتی ہیں اس طرح یہ وبا اب مسلم معاشرے کو بھی اپنے گھیرے میں لے چکی ہے۔

کیا لڑکی والا گنہگار ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ آج ایک غریب شخص جس کے یہاں دو چار لڑکیاں موجود ہیں وہ گویا کہ زندہ درگور ہے۔ وہ نہ تو لڑکے والوں کے مطالبات اور پھر آئے دن کی فرمائشیں پوری کرسکتا ہے اور نہ جوان لڑکیوں کو اپنے گھر میں رکھ کر چین کی نیند ہی سو سکتا ہے۔ جوان لڑکیاں اس کے گلے کا پھندا بن چکی ہیں۔ گویا کہ وہ بجائے لڑکوں کو جنم دینے کے لڑکیوں کو جنم دینے کا ''گنہگار'' ہے۔ لیکن کیا وہ حقیقتاً گنہگار ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ یہ فعل دراصل اس کا اپنا فعل نہیں بلکہ خلاق ازل کا ہے۔

لڑکیاں ربوبیت کی نشانی

ذرا غور سے سنئے قرآن مجید اس سلسلے میں کیا کہتا ہے۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَاءُ اِنَاثًا وَ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَاءُ الذُّكُوْرَ. اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّ اِنَاثًا وَ يَجْعَلُ مَنْ يَّشَاءُ عَقِيْمًا اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ'' (سورۃ شوریٰ 42، آیت 49 سے 50)

زمین اور آسمانوں میں اللہ ہی کی بادشاہی ہے۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جسے چاہتا ہے لڑکیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے۔ یا لڑکے اور لڑکیاں مشترکہ طور پر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے۔ یقیناً وہ سب کچھ جاننے والا اور بڑی قدرت والا ہے۔

لہٰذا کسی کے گھر لڑکیاں پیدا ہونا اگر کوئی جرم ہے تو یہ جرم لڑکیوں کے باپ پر نہیں بلکہ

خالق کائنات پر عائد ہونا چاہئے۔ مگر ظاہر ہے کہ خالق کائنات پر اس قسم کا جرم عائد نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس نے اپنی حیرت انگیز ربوبیت کے ذریعے مردوں اور عورتوں کے درمیان ایک بھرپور توازن قائم کر رکھا ہے۔ اگر یہ توازن نہ ہو تو نسل انسانی کے سلسلے میں خلل واقع ہوسکتا ہے۔ لڑکیوں کے وجود کو منحوس سمجھنے والوں کو خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اگر لڑکیاں نہ ہوں تو پھر لڑکوں کے لئے جوڑا کہاں سے میسر آئے گا؟ اگر تمام لوگ اپنی نوزائیدہ لڑکیوں کو زہر دے کر ماردیں یا دوران حمل طبی معائنہ کرا کے حمل ساقط کرادیں (جس کا رجحان اب کافی بڑھتا جا رہا ہے) تو پھر صرف لڑکوں کا کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ اس طرح نوع انسانی کا وجود ہی ختم ہو جائے گا اور یہ نوع انسانی کی گویا کہ اجتماعی خودکشی ہوگی۔

اس بحث سے بخوبی ثابت ہوگیا کہ اللہ کا کوئی بھی فعل حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ یہ انسانی کرتوت ہیں جو الٰہی نظام کو بگاڑنا اور قانون فطرت کو متاثر کرنا چاہتے ہیں اور قانون فطرت میں دخل اندازی کی سزا بالآخر اس کو بھگتنی پڑے گی جو ایک تلخ حقیقت کے طور پر اس کے سامنے آئے گی۔

غرض جیسا کہ عرض کیا جا چکا عورت خلاق عالم کا حسین ترین تخلیقی شاہکار اور انسان کے لئے خدائے رحمان کا سب سے بڑا قیمتی تحفہ ہے جو اُنس و محبت کے لئے پیدا کی گئی ہے نہ کہ نفرت و حقارت کے لئے۔ اس لحاظ سے لڑکیاں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت و خلاقیت کی نشانی ہیں۔ لہٰذا انہیں کسی بھی اعتبار سے منحوس یا قابل نفرت سمجھنا یا ان کی طرف حقارت کی نظر سے دیکھنا اللہ رحمان کی ربوبیت و خلاقیت کی توہین ہے اور ایسے لوگ بہت جلد یہ حقیقت فراموش کر دیتے ہیں کہ خود ان کا اپنا وجود بھی ایک مرد اور ایک عورت کا مرہون منت رہا ہے۔ دنیا کے اس مظلوم ترین طبقے کے ساتھ جو ناانصافیاں ہوئی ہیں ان کے ازالے کے لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت اور ان کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آنے پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور ایسے شخص کو جنت کی بشارت دی ہے جو اپنی لڑکیوں کی اچھی ربیت کر کے ان کے لئے اچھا رشتہ تلاش کرتا ہو۔ اس اعتبار سے لڑکیاں اللہ کی ایک مقدس امانت ہیں، لہٰذا ان کی قدر کرتے ہوئے انہیں ان کا صحیح مقام دینا چاہئے۔

جہیز کی شریعت میں کوئی حیثیت نہیں

بہر حال لڑکیوں کا باپ ہونے کے ناطے ایک غریب پر ناجائز بوجھ ڈال کر اس کی کمر توڑی نہیں جا سکتی۔ ہاں اگر صاحب تیسیر آدمی اپنی لڑکی کو اپنی خوشی سے کچھ دے دے تو یہ جائز اور روا ہے مگر وہ کوئی ضروری اور لازمی چیز نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر اگر کوئی کچھ بھی نہ دے تب بھی اس پر کوئی گلہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اسلامی شریعت میں جہیز کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ اگر جہیز شرعاً ضروری ہوتا تو قرآن اور حدیث میں اس کی تاکید ضرور ملتی۔ جب کہ یہ دونوں اس باب میں خاموش ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہیز ایک غیر ضروری چیز ہے لہٰذا مالدار لوگوں کو نمائشی جہیز دینے سے سخت پرہیز کرنا چاہئے کیونکہ مالداروں ہی کا رویہ غریب طبقے میں فتنے پیدا کرتا ہے۔

حضرت فاطمہؓ کے جہیز کی نوعیت

اب رہی یہ بات کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہؓ کو کچھ چیزیں شادی کے موقع پر عطا فرمائی تھیں، تو دراصل حضرت فاطمہؓ کے مہر کی رقم سے یہ چیزیں فراہم کی گئی تھیں۔ چنانچہ سیرت نگاروں کے بیان کے مطابق حضرت علیؓ کے پاس ایک زرہ تھی جو انہوں نے بطور مہر معجّل (وہ مہر جو فوری طور پر ادا کر دیا جاتا ہے) دے دی تھی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فروخت کرا دیا اور اس رقم سے بستر، تکیہ اور کچھ چیزیں مہیا کر دیں۔ (زرقانی شرح مواہب) اس سے یہ حقیقت صاف ظاہر ہو گئی کہ حضرت فاطمہؓ کا "جہیز" (اگر اس کو جہیز کا نام دیا جائے) پیشگی مہر کے پیسوں سے تیار کیا گیا تھا نہ کہ اپنی طرف سے۔ چنانچہ اس طرح پیشگی مہر کے پیسوں سے جہیز تیار کرنے کا رواج آج بھی مصر وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔ اگر اس قسم کا جہیز شروع ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی چاروں بیٹیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ فرماتے جبکہ یہ بات بخوبی ثابت ہے کہ آپ نے سوائے فاطمہؓ کے کسی دوسری بیٹی کو اس قسم کی چیزیں نہیں دیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت علیؓ آپ ہی کے پروردہ تھے۔ چنانچہ آپ نے انہیں یہ چیزیں ایک داماد کی حیثیت سے نہیں

بلکہ ایک سرپرست ہونے کے ناتے عنایت فرمائی تھیں اور وہ بھی مہر کی رقم سے۔ لہٰذا اس سے فرمائشی جہیز اور اس سے بھی بڑھ کر جوڑے گھوڑے وغیرہ ناجائز مطالبات کا جواز کہاں سے نکل سکتا ہے؟

فرمائشی جہیز رشوت اور حرام ہے

جہاں تک فرمائشی جہیز کا سوال ہے تو یہ شرعاً رشوت کے حکم میں آنے کی وجہ سے بالکل ناجائز اور حرام ہے اور اگر کسی نے غلطی سے لے لیا ہے تو اس کا واپس کرنا شرعاً واجب ہے۔ واضح رہے کہ ایک زمانے میں جب کہ موجودہ دور کے برعکس لڑکی والے رخصتی کے وقت لڑکے والوں سے کچھ رقم لے کر لڑکی کو رخصت کرتے تھے۔ (اور یہ رواج آج بھی پٹھانوں اور بعض عربوں میں پایا جاتا ہے) تو اس وقت فقہائے امت نے اس کو رشوت قرار دے کر حرام کہا تھا اور اس کو لوٹانا ضروری قرار دیا تھا۔ مثلاً فتاویٰ عالمگیری میں مذکور ہے کہ "اگر لڑکی والوں نے رخصتی کے وقت شوہر سے کچھ رقم لے لی ہے تو شوہر کو اختیار ہو گا کہ اسے واپس لے لے کیونکہ یہ رشوت ہے۔" (عالمگیری بحوالہ بحر الرائق) اور فتاویٰ شامیہ میں ایسی رقم کو "سحت" یعنی حرام کہا گیا ہے۔ خواہ دینے والے نے خوش دلی ہی سے کیوں نہ دیا ہو۔ (جلد پنجم صفحہ 301 مطبوعہ کوئٹہ) ظاہر ہے کہ جب لڑکے سے کچھ لینا رشوت اور حرام ہے تو پھر لڑکی یا اس کے اعزہ سے بھی کچھ لینا اسی طرح رشوت اور حرام ہو سکتا ہے۔ عقلی اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ فریقین میں سے اگر کوئی اس قسم کی رقم لینے کا زیادہ مستحق ہوتا تو وہ لڑکی کا باپ ہی ہو سکتا تھا، کیونکہ اس نے کم از کم پندرہ بیس سال تک اپنی لڑکی کی پرورش کی ہے اور اس پر اپنی رقم خرچ کر کے اسے اس قابل بنایا کہ وہ کسی دوسرے کے گھر کی زینت بن سکے۔ مگر اس کے باوجود جب وہ اپنے داماد سے کوئی رقم نہیں لے سکتا تو پھر بھلا داماد اپنے سسر سے اس قسم کی کوئی رقم کس طرح لے سکتا ہے جبکہ سسر پر اس کا کوئی استحقاق ہی نہیں ہے؟ اس طرح یہ فعل عقلی اعتبار سے بھی سراسر ناجائز ہے اور اس لحاظ سے فرمائشی جہیز یا نقد رقم کا مطالبہ ایک اخلاقی و سماجی جرم ہی نہیں بلکہ شرعی اعتبار سے گناہ کبیرہ کے حکم میں آ سکتا ہے جس کی وجہ سے آج ہزاروں معصوم لڑکیوں کی جان کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ لہٰذا

جس قدر جلد ہو سکے اس فتنے اور سماجی جرم کا خاتمہ ضروری ہے۔

مرد طالب، عورت مطلوب

یہ بات بخوبی اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ نظامِ فطرت کے مطابق مرد "طالب" اور عورت "مطلوب" ہوتی ہے۔ لہٰذا عورت کے حصول کے لئے مرد ہی کو مالی جدوجہد اور قربانی دینی پڑے گی۔ عورت سے کسی بھی قسم کا مطالبہ نظامِ فطرت کے خلاف ہے، جو الٹی گنگا بہانے کے مترادف ہے اور اس قسم کے مطالبات شرعاً ناجائز ہیں۔ (قرآن مجید میں جہاں پر "ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھانے" کا بیان آیا ہے، اس میں یہ شق بھی ہو سکتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ :(سورۃ نساء 4، آیت 29) اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق مت کھاؤ۔

معاشرتی فتنوں کا سدباب ضروری

شادی ہو جانے کے بعد عورت کی دیکھ بھال اور اس کا نان و نفقہ مرد کے ذمہ واجب ہو جاتا ہے اور اس صورت میں بھی عورت پر کسی قسم کا مالی بوجھ نہیں ڈالا جا سکتا، خواہ عورت کتنی ہی مالدار کیوں نہ ہو مگر آج کل غیر مسلموں کی دیکھا دیکھی معاملہ فرمائشی جہیز کے بعد بھی ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ وہ شادی کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ "آئے دن" "مطالبات" میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے اور قسمت کی ماری نو بیاہتا عورتوں کو اس سلسلے میں نہ صرف طرح طرح کی تکلیفیں دی جاتی ہیں بلکہ خود اپنا سکھ چین بھی غارت کر لیا جاتا ہے۔ اس قسم کا سلوک شرعی اعتبار سے قطعاً ناجائز اور حرام ہے جو اللہ کے عذاب کو دعوت دینے والا ہے۔ لہٰذا اگر با اختیار لوگوں نے اس قسم کے معاشرتی فتنوں کے سدباب اور اصلاح معاشرہ کی کوشش نہیں کی تو پھر اس کا وبال پورے معاشرے پر پڑنا لازمی ہو جائے، جیسا کہ قرآن مجید میں انتباہ دیا گیا ہے۔

واتقفو فتنة لا تصيبن الذين ظلمو منكم خاصة واعلمو ا ان الله شديد العقاب (سورۃ انفال 8 آیت 25) اور تم اس فتنے سے بچتے رہو جو تم میں

سے خاص کر ظالموں ہی پر نہ پڑے گا (بلکہ تم سب اس کی لپیٹ میں آ جاؤ گے) اور جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

معاشرتی استحکام کی بنیاد

میاں بیوی کے تعلقات جب تک خوشگوار نہ ہوں، کسی خاندان کی بنیاد پڑ ہی نہیں سکتی اور مختلف خاندانوں کے مجموعے ہی کا نام ایک معاشرہ ہوتا ہے لہٰذا جب خاندان تباہ ہو جائیں تو پھر معاشرہ بھی خود بخود تباہ و غارت ہو جائے گا۔ اسی لئے اسلام میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کو ایمان جیسی اعلیٰ ترین شے کا ضروری جزو قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد رسول ہے: "ایمان کے اعتبار سے کامل ترین شخص وہ ہے جس کے اخلاق سب سے زیادہ اچھے ہوں اور تم میں سب سے بہتر لوگ وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے ساتھ بہتر سلوک کرتے ہوں۔" (جامع ترمذی)

اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ جو شخص اپنی شریک حیات کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرتا وہ گویا کہ ایمانی صفت سے تہی دامن ہے اور اس کا سلوک جس قدر اپنی شریک حیات کے ساتھ بہتر رہے گا وہ اسی قدر "صاحب ایمان" کہلائے گا۔ اس لحاظ سے جو شخص اپنی بیوی کو خواہ مخواہ ستاتا ہے وہ بے ایمان ہونے کی بنا پر لعنتی اور مردود ہے کیونکہ ایسا شخص نہ صرف ایک "شاہکار ربوبیت" کی توہین کرتا ہے بلکہ وہ ایک ایسے بندھن کو بلاوجہ توڑنے کی بھی کوشش کرتا ہے جس کو اللہ نے جوڑا تھا۔ اس طرح کا معاشرتی ظلم اور ناحق کوشی اللہ کو سخت ناپسند ہے۔

میاں بیوی کے اختلافات خاندانی دشمنی کو جنم دیتے ہیں جو نسل ہا نسل تک چلتی رہتی ہے اور یہ وہ آگ ہے جس نے بڑے بڑے کنبوں کو جلا کر خاکستر کر دیا ہے۔ بعض حدیثوں کے مطابق میاں بیوی کے اختلافات سے سب سے زیادہ خوشی شیطان کو ہوتی ہے جو اپنے چیلوں کے ذریعے یہ کام کراتا ہے۔

عورتوں پر مردوں کی فضیلت کی وجہ

اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر دو وجہوں کی بنا پر فضیلت عطا کی ہے۔ ایک یہ کہ اللہ نے مردوں کو زیادہ قوی اور طاقتور بنایا ہے اور دوسرے یہ کہ اس قوت وطاقت کی بنا پر عورتوں پر رقم خرچ کرنا مردوں ہی کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاۗءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (سورۃ نساء 4، آیت 33) مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔ اس واسطے کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس واسطے بھی کہ مردوں نے اپنے اموال (عورتوں پر) خرچ کئے ہیں۔

نیز ایک دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کا نفقہ مردوں ہی کے ذمہ ہے۔

وَاسْـَٔــلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْـَٔــلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا (سورۃ ممتحنہ 60، آیت 10) اور جو تم نے ان عورتوں پر خرچ کیا ہے وہ ان سے مانگ لو اور جو انہوں نے خرچ کیا ہے وہ (تم سے) مانگ لیں۔

یہ آیت کریمہ ان مسلمان مہاجر خواتین کے بارے میں ہے جو ہجرت کے دور میں اپنے کافر ومشرک شوہروں کو چھوڑ کر مکہ سے مدینہ منورہ آ گئی تھیں۔ تو اس موقع پر سوال پیدا ہوا کہ اس کا شرعی حل کیا ہوگا؟ تب حکم الٰہی ہوا کہ تم ان مومن عورتوں کو مکہ والوں کے سپرد مت کرو بلکہ جو کچھ رقم ان کے کافر شوہروں نے ان پر خرچ کی تھیں وہ انہیں واپس کر دو۔ اسی طرح جو کافر ومشرک عورتیں تمہاری زوجیت میں ہوتے ہوئے مکہ مکرمہ میں رہ گئی ہوں ان پر خرچ کی ہوئی رقم تم ان کے متعلقین سے طلب کرو۔

خدا کی عطا کردہ فضیلت کا انکار

اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس "خرچ" میں کون کون سی رقم شامل ہے یا ہو سکتی ہے؟ تو اس میں اگرچہ مفسرین کی تصریح کے مطابق مراد مہر ہے، مگر اس کے عموم میں ہر قسم کا خرچ شامل ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے مرد کے ذمہ تین قسم کے اخراجات ہو سکتے ہیں:

(1) شادی کا خرچ، (2) مہر کی رقم، (3) نان ونفقہ۔ اس طرح عورت کے حصول کے لئے مال خرچ کرنے کی ذمہ داری شرعاً مرد پر عائد ہوتی ہے نہ کہ عورت پر۔ اس کا برعکس برتاؤ مرد کی شرافت ومردانگی کے خلاف ہے، جو ایک غیر فطری طریقہ ہے بلکہ اللہ نے جس بنا پر مردوں کو فضیلت عطا کی ہے اس کا کھلم کھلا انکار ہے۔ یہ بات خوب یاد رکھنی چاہئے کہ پیسہ اور مال ودولت ایک ڈھلتی چھاؤں ہے، جس کا کوئی اعتبار نہیں۔ لہٰذا چند سکوں کی خاطر اپنے آپ کو بازار میں نیلام کرنا اور پھر مزید مطالبات کی خاطر اپنی شریک حیات پر ظلم وستم کرنا ایک گھٹیا حرکت ہے، جو شادی بیاہ کے اصل مقصد کے خلاف ہے، یہیں سے دو خاندانوں میں نفرت وعداوت کی ابتدا ہوتی ہے، جو آگے چل کر مستقل دشمنی کا باعث بن جاتی ہے۔ اس طرح خاندانوں کے خاندان ٹوٹ ٹوٹ کر تباہ ہو رہے ہیں۔

مہر کی شرعی حیثیت

قرآن اور حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر اور نان ونفقہ شوہر کے ذمہ ہر حال میں فرض ہے اور مہر کی رقم تو صحیح اسلامی اصول کے تحت اکثر وبیشتر شادی کے موقع پر پیشگی ادا کر دی جاتی ہے۔ مہر عورت کا ایک شرعی حق ہے اور وہ شادی کے فوراً بعد یا کچھ مدت میں (اگر اس کا تعین پہلے ہی سے کر لیا جائے) واجب الادا ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ عورتوں کے مہر کی ادائیگی کی سخت تاکید آئی ہے اور حدیثوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی شخص کا نکاح کرتے تو سب سے پہلے اسے مہر کے لئے کوئی چیز لانے کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ اس طرح اسلامی معاشرے میں پیشگی مہر ادا کرنے کا رواج رہا ہے۔

عورتوں کی حق تلفی

مگر آج ہندوستان میں یہ غلط رواج چل پڑا ہے کہ لوگ اپنی بیویوں کا مہر تو ادا نہیں کرتے، جو ان کا ایک شرعی حق ہے، مگر ایک غیر شرعی مطالبہ (جہیز یا جوڑے گھوڑے کی رقم کا) کرتے ہوئے اس کو شریعت اور قانون سے بھی زیادہ بڑا درجہ دے چکے ہیں اور اس کے

بھیانک اثرات سے آج خاندان ٹوٹ رہے ہیں اور معاشرہ تباہ ہو رہا ہے۔ فرمائشی جہیز آج معاشرہ کا ایک رِستا ہوا ناسور اور تباہی کی علامت بن چکا ہے۔ لہٰذا اس کو جتنی جلد ہو سکے ختم کر کے نظامِ فطرت اور قانون خداوندی کی پابندی کرنی چاہئے اور اس سلسلے میں ہر قسم کی فضول خرچیاں یک لخت ختم کر کے سیدھے سادے طریقے سے نکاح کی مجلسیں منعقد کرنی چاہئیں کیونکہ فضول خرچی کرنے والے شریعت کی نظر میں شیطان کے بھائی ہیں۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17، آیت 27) مال و دولت بھی اللہ کی ایک امانت ہے، جس کے غلط مصرف کا حساب دینا پڑے گا۔ آج مالداروں کے نام و نمود اور نمائشی مظاہروں نے غریبوں کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ لہٰذا فضول خرچی اور نمائشی مظاہروں پر روک لگانا ضروری ہے۔

اصلاح معاشرہ اور نوجوانوں کی ذمہ داری

اس میدان میں ہمارے نوجوان طبقے کو آگے بڑھ کر اصلاحی قدم کرنا چاہئے اور یہ عہد کرنا چاہئے کہ وہ فرمائشی جہیز یا جوڑے گھوڑے کی رقم نہ تو کسی سے لیں گے اور نہ کسی کو دیں گے اور جو لوگ جہیز یا جوڑے گھوڑے کا مطالبہ کریں تو انہیں پہلے سمجھانا چاہئے کہ یہ چیز شریعت کی نظر میں غیر مشروع اور ناجائز ہے۔ مگر پھر بھی وہ نہ مانیں اور اس پر اصرار ہی کرتے رہیں تو ایسے لوگوں کا مقاطعہ یعنی سوشیل بائیکاٹ کرنا چاہئے تاکہ ان کا دماغ ٹھکانے لگ جائے۔ اگر مسلم نوجوان ہر محلہ اور ہر گاؤں میں ایک ایک کمیٹی (مخالف جہیز کمیٹی) قائم کر کے اس سلسلے میں اقدام کریں تو اس سے بڑے بڑے اچھے نتائج نکل سکتے ہیں اور غریب و معصوم لڑکیوں کا بھلا ہو سکتا ہے، جو جہیز کی رقم نہ ہونے کی وجہ سے سالہا سال سے ایسے نیک سیرت لڑکوں کی راہ تک رہی ہیں جو آگے بڑھ کر ان بے کسوں کا ہاتھ تھام سکیں اور ایک پُر مسرت اور خوشگوار زندگی کا آغاز کر سکیں، جو بناوٹی رشتے ناتوں کے بجائے حقیقی بنیادوں پر قائم ہو اور اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی بھی شامل ہو۔

اس قسم کا اصلاحی اقدام نہ صرف اللہ اور رسول کی خوشنودی کا باعث ہوگا بلکہ ایک اچھے اور مثالی معاشرے کی تشکیل نو کی راہ میں معاون و مددگار بھی ہو سکے گا اور اس میدان میں جب تک نوجوان آگے نہیں بڑھیں گے کوئی بھی اصلاحی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔

لہٰذا اس راہ میں سب سے پہلے چند صالح اور با اثر نوجوانوں کو آگے آنا چاہئے۔ اللہ کرے کہ یہ چند سطریں ہمدردان ملت کے دلوں پر اثر کر جائیں۔

حضرت فاطمہؓ کا جہیز کیا ہے؟

دنیائے انسانیت کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ

قرآن اور حدیث میں کہیں بھی یہ بات مذکور نہیں ہے کہ جب تم اپنی لڑکی کو بیاہ کر کے رخصت کرنے لگو تو اس کے ساتھ کچھ سامان بھی بطور جہیز ضرور دو مگر اس سلسلے میں بعض لوگوں کو غلط فہمی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لاڈلی بیٹی اور خاتون جنت حضرت فاطمہ زہراؓ کو کچھ چیزیں رخصتی کے وقت دی تھیں اور اس بنا پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر شریعت کی رو سے جہیز دینا ضروری نہیں ہے تو پھر خود رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیوں کیا تھا؟ تو اس کے جواب کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ سرکار دو جہاں نے اپنی لخت جگر کو جو چیزیں عنایت فرمائی تھیں وہ نہایت درجہ معمولی چیزیں تھیں جو جہیز کی تعریف میں نہیں آتیں۔ چنانچہ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ: "رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک چادر، ایک مشک اور ایک تکیہ دیا تھا جس میں (اذخر نامی) گھاس بھری ہوئی تھی۔" (نسائی جلد ششم صفحہ 135، مطبوعہ بیروت) اور بعض کتابوں میں ایک بستر کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ کیا یہ چیزیں واقعتاً جہیز ہیں؟ پھر کیا ان چیزوں کو موجودہ دور کے پر تکلف اور انواع و اقسام کے سامانوں اور دنیا بھر کی خرافات سے کوئی تعلق ہے؟

دوسری بات یہ کہ بعض کتابوں میں تصریح موجود ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی کو جو چیزیں عنایت فرمائی تھیں وہ اپنی طرف سے نہیں تھیں بلکہ دراصل حضرت علیؓ سے مہر "معجّل" (وہ مہر جو فوری طور پر ادا کر دیا جائے) لے کر اس سے وہ چیزیں خریدوائی گئی تھیں۔ چنانچہ یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے کہ حضرت علی کے پاس ایک زرہ تھی، جسے انہوں نے بطور معجّل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر کر دیا۔ (دور رسالت کے رواج کے مطابق نکاح سے پہلے سونا یا کوئی چیز بطور مہر پیش کرنا ضروری تھا، جیسا کہ

متعدد احادیث سے اس پر روشنی پڑتی ہے) چنانچہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فروخت کرنے کا حکم دیا اور اس سے 480 درہم حاصل ہوئے۔ پھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلالؓ سے فرمایا کہ اس رقم سے کچھ خوشبو، کپڑے اور فلاں فلاں چیزیں خرید کر لاؤ۔

(زرقانی، شرح مواہب)

چنانچہ اس فہرست میں بستر اور تکیہ بھی تھا۔ جہیز فاطمہؓ کی حقیقت! ظاہر ہے کہ اول تو یہ سرے سے جہیز نہیں ہے، لیکن اگر اس کو بالفرض جہیز تسلیم بھی کر لیا جائے تو وہ لڑکی کے باپ کی طرف سے نہیں بلکہ داماد سے حاصل کردہ مہر کے پیسوں سے ہے۔ لہٰذا اس کو جہیز اور وہ بھی فرمائشی جہیز سے کیا نسبت ہے؟

تیسری بات یہ ہے کہ اگر جہیز دینا شریعت کی نظر میں اہم ہوتا ہے تو پھر آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تمام صاحبزادیوں کو بھی جہیز دیتے۔ چنانچہ آپ کی چار صاحبزادیاں تھیں۔ مگر تاریخ و روایات سے یہ بات ثابت نہیں ہے کہ آپ نے سوائے حضرت فاطمہؓ کے کسی دوسری صاحبزادی کو اس قسم کی چیزیں دی ہوں۔ لہٰذا لڑکی کے لئے جہیز شرعاً غیر ضروری ہے۔

چوتھی بات یہ کہ حضرت علیؓ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پروردہ تھے اور آپ ہی کے ساتھ رہتے تھے۔ لہٰذا اگر آپ نے کوئی چیز دی بھی تو وہ بطور جہیز نہیں بلکہ حضرت علیؓ کے ایک سرپرست ہونے کی حیثیت سے دی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایک سرپرست ہونے کے ناطے بیٹی داماد کے لئے کچھ نہ کچھ انتظام کرنا ہی پڑتا۔

اور پانچویں بات یہ کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل میں موجودہ دور والوں کے لئے بڑی عبرت ہے کہ آپ نے اپنے داماد کو کچھ بھی نہیں دیا، نہ جوڑا اور نہ گھوڑا اور داماد نے بھی اپنے سسر سے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا، نہ گھوڑے کا، نہ اونٹ کا اور نہ سونے اور چاندی کا کیونکہ یہ ساری چیزیں مقصد ازدواج سے میل نہیں کھاتیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سنت رسول کا سب سے زیادہ تابناک پہلو ہے جو عصر جدید کے لئے ایک تازیانہ ہے۔ تو آج کے مسلمان اپنے پیارے رسول کی اس پیاری سنت پر عمل کیوں نہیں کرتے جس میں ان کی زندگی کی ضمانت ہے؟ ظاہر ہے کہ ایک مسلمان کی سعادت کے لئے اس سے بڑا نمونہ اور کیا

ہو سکتا ہے؟ اور جس چیز کو اللہ اور اس کے رسول نے غیر ضروری قرار دے دیا ہے اس پر اصرار کیوں ہے؟ یہی وجہ ہے کہ شریعت کی نظر میں اس قسم کے مطالبات ناجائز اور حرام ہیں اور جو لوگ اپنی عیاشیوں کے لئے ناجائز طریقوں سے اپنے سسرال والوں کو لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں وہ دراصل ڈاکو ہیں جو ایک جونک کی طرح سسرالی رشتہ داروں کا خون چوستے رہتے ہیں اور ایسے لوگ دراصل اپنے پیٹوں میں دوزخ کی آگ بھرتے ہیں جن کے دلوں سے خوف خدا پوری طرح رخصت ہو گیا ہے اور اس لوٹ کھسوٹ میں وہ لوگ بھی کچھ پیچھے نہیں ہیں جو مسجدوں میں اگلی صفوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ گویا کہ نماز اور کلمہ کی حقیقت ان کے حلق کے نیچے نہیں اتر سکی ہے۔

غرض ان ملاحظات سے بخوبی واضح ہو گیا کہ اسلامی شریعت میں جہیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے، بلکہ اگر اہمیت ہے تو مہر کی ہے۔ مگر موجودہ دور میں اس کے برعکس جہیز نقد اور مہر ادھار ہو کر رہ گیا ہے جو ایک جاہلی طریقہ ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ جس چیز کو اسلامی شریعت نے فرض قرار دیا ہے اس کی تو موجودہ مسلمان کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے، مگر جس چیز کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے اس پر اصرار ہے۔ تو یہ قانون الٰہی کے ساتھ ایک مذاق ہے جو غضب الٰہی کو دعوت دینے والا ہے۔

نیز حضرت علیؓ کے اس واقعہ میں ہمارے لئے ایک اور عبرت بھی موجود ہے۔ وہ یہ کہ نکاح کے بعد ولیمہ کرنا لڑکی کے باپ کا ذمہ نہیں بلکہ خود لڑکے کا ذمہ ہے۔ چنانچہ کسی بھی حدیث سے یہ ثابت نہیں ہے کہ حضرت فاطمہؓ کی شادی کے موقع پر رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے دعوت کی ہو۔ بلکہ مسلم شریف کی ایک روایت کے مطابق ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنی شادی کا ولیمہ کرنے کے لئے جنگل سے گھاس لا کر فروخت کرنے کی کوشش کی تھی۔ (صحیح مسلم جلد سوم صفحہ 1069، مطبوعہ ریاض)

اور ولیمہ کرنے کے لئے کوئی ضروری نہیں ہے کہ گوشت روٹی ہی کھلائی جائے بلکہ صرف کھجور کھلا دینا یا شربت وغیرہ پلا دینا بھی کافی ہے۔ (دیکھئے صحیح بخاری جلد ششم صفحہ 145، مطبوعہ استانبول)

ایک اور حدیث کے مطابق اس حقیقت پر بھرپور روشنی پڑتی ہے کہ شادی بیاہ انتہائی

سادگی کے ساتھ اور اپنی بساط کے مطابق کرنی چاہئے کیونکہ وہ خانہ آبادی کا ذریعہ ہوتی ہے نہ کہ خانہ بربادی کا۔ چنانچہ اس سلسلے میں خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی لخت جگر اور خاتون جنت کی شادی اور رخصتی جس سادگی کے ساتھ اور ہر قسم کے تکلفات سے عاری ہو کر عمل میں آئی تھی وہ ساری امت کے لئے ایک درس اور پوری دنیائے انسانیت کے لئے ایک یادگار نمونہ و مثال ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو حکم دیا کہ ہم فاطمہؓ کو تیار کر کے علیؓ کے پاس پہنچا دیں۔ لہٰذا ہم گھر گئے اور اس میں بطحاء کی نرم پٹی بچھادی۔ (گویا کہ یہی فرش تھا)۔ پھر ہم نے دو تکئے رکھ دیئے جن میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔ ان کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے ٹھیک کیا۔ پھر ہم نے (ولیمے میں) کھجور اور منقیٰ کھلایا اور ٹھنڈا پانی پلایا۔ پھر ہم نے ایک لکڑی لے کر اسے کمرے میں ایک طرف لگادیا تا کہ اس پر کپڑے ڈالے جا سکیں اور مشک وغیرہ لٹکایا جا سکے۔ تو ہم نے فاطمہ کی شادی سے اچھی کوئی شادی نہیں دیکھی۔ (سنن ابن ماجہ، جلد اول صفحہ 616، مطبوعہ بیروت)

اللہ اکبر! سرکار دو جہاں کی لاڈلی بیٹی اور مٹی کا فرش! اور تکئے کا ہے کے؟ کھجور کی چھال بھرے! اور ولیمے میں کیا؟ محض کھجور، منقیٰ اور میٹھا پانی! حد ہو گئی اس سادگی کی اور پھر حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ کا یہ کہنا کیا معنی رکھتا ہے کہ ہم نے فاطمہ کی شادی سے بہتر شادی کسی کی نہیں دیکھی؟ گویا انہوں نے دراصل یہ کہنا چاہا ہے کہ جس کسی کو شادی میں اتنی چیزیں بھی میسر آجائیں وہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھے! لیکن آج ہم نے شادی بیاہ کو اپنی بدعملی کے باعث خواہ مخواہ ایک زحمت کی چیز بنا لیا ہے حالانکہ شادی دیگر ضروریات زندگی کی طرح ایک بالکل آسان چیز ہے۔

غرض آپ نے دیکھا کہ خاتون جنت اور زہرا بتولؓ کے عقد مبارکہ میں نہ ڈولی ہے اور نہ بارات! نہ جلوس ہے اور نہ اظہار شان و امارت! نہ لوگوں کا جمگھٹا اور نہ میلہ وٹھیلہ! نہ مخمل و کمخواب اور نہ حریر و دیبا! نہ مسہری، نہ نرم و نازک گدے اور نہ ریشمی تکئے اور چادریں! نہ بریانی اور نہ پلاؤ! نہ متنجن و مزعفر اور نہ فیرنی و شیر مال! بلکہ فرش ہے تو مٹی کا اور تکئے کھجور کی چھال بھرے اور ولیمے میں صرف کھجور اور پانی۔ یہ ہے تاجدار مدینہ کی سب سے زیادہ چہیتی

اور لاڈلی بیٹی کا "پر تکلف" نکاح اور ولیمہ! کیا اس میں ہمارے لئے کوئی سبق نہیں ہے؟ کیا آج کے امتیوں کو کوئی نسبت ہے اپنے رسول کے اس طرز عمل سے؟ کیا آج کسی کو اس قدر سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ اپنی لڑکیوں کا نکاح کرنے میں شرم آتی ہے یا عار محسوس ہوتا ہے؟ کیا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر چاہتے تو اپنی لخت جگر کی شادی نہایت درجہ ٹھاٹ باٹ کے ساتھ نہیں کر سکتے تھے؟ پھر آپ نے ایسا کیوں کیا؟ محض اس لئے کہ اپنی امت کے لئے آسانیاں پیدا ہوں اور آپ کی امت بلاوجہ مشقت میں نہ پڑ جائے۔ مگر آج ہم اپنے رسول کی اس سنت پر عمل کرنے میں عار کیوں محسوس کرتے ہیں؟ کیا کسی کی لڑکی مرتبے میں جگر گوشہ رسول سے بڑھ کر ہو سکتی ہے؟ آج ہم نے جس جھوٹے وقار کو عزت اور شان و شوکت سمجھ لیا ہے وہ محض ایک دکھاوا اور نمائش ہے جو خدا اور رسول کی نظر میں ذرا بھی پسندیدہ نہیں ہے۔ جو لوگ بلاوجہ مال و دولت کا اسراف کرتے ہیں وہ قرآن کی نظر میں شیطان کے بھائی ہے۔ (سورۃ بنی اسرائیل 16، آیت 27) اللہ تعالیٰ جب کسی کو مال و دولت دیتا ہے تو وہ آزمائش کی خاطر دیتا ہے، جس کا حساب کتاب ہر انسان سے وہ آخرت میں لے گا کہ اس نے اللہ کے دیئے ہوئے مال کو دنیا میں کس طرح خرچ کیا؟ لہٰذا انسان کو مال و دولت پا کر مغرور نہیں ہو جانا چاہئے بلکہ اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اس کو خرچ کرنا چاہئے۔ ورنہ دین و دنیا دونوں کی تباہی ہے۔

جہیز فساد تمدن کا باعث

جو مفت خوری کا ذریعہ بن رہا ہے

جہیز آج ہندوستانی لغت میں گدائی یا مفت خوری کا ہم معنی بن چکا ہے جو ایک بے خدا قوم کے شایان شان تو ہو سکتا ہے مگر یہ چیز ایک ایسی ملت کے شایان شان ہرگز نہیں ہو سکتی جس کا ایمان ایک زندہ اللہ اور زندہ کتاب پر ہے بلکہ یہ مسلم سماج کے لئے ایک ایسا زہریلا انجکشن ہے جو ہمارے معاشرے کے بیشتر افراد کو موت کی نیند سلا چکا ہے اور اس کی زہرناکی سے بے شمار خاندان جاں بلب ہو چکے ہیں۔ اس اعتبار سے آج ہندوستانی مسلمان ایک دوراہے پر کھڑے ہیں۔ ایک طرف اسلامی نظام ہے تو دوسری طرف جاہلی نظام جو انسانی

اقدار کو ہڑپ کرنے کے لئے پوری طرح تیار کھڑا ہے۔ ایک میں سراسر زندگی ہے تو دوسرے میں سراسر موت، صرف افراد کی نہیں بلکہ قوموں اور ملتوں کی موت، مگر بہر حال انسان کو اختیار ہے کہ وہ جس نظام کو چاہے اپنے لئے پسند کرلے۔ علامہ اقبال کی زبان میں

یہ بندگی خدائی وہ بندگی گدائی
یا بندۂ خدا بن یا بندۂ زمانہ

کوئی بھی سماجی بگاڑ انسان کا لایا ہوا ہوتا ہے جب کہ سماج کے افراد اندھے، بہرے اور خود غرض بن جاتے ہیں۔ آج جہیز کے غیر معقول اور ہولناک رواج کے باعث ہندوستانی سماج اپنی تباہ کی انتہائی منزلیں طے کررہا ہے اور بیرومیٹر ایک خطرناک طوفان کی خبر دے رہا ہے۔ لہٰذا آج اصلاح معاشرہ کے لئے ضرورت ہے کہ جہیز کی برائی اور اس کی قباحت پورے شرعی و عقلی دلائل کی روشنی میں واضح کی جائے۔ لہٰذا اس موقع پر جہیز کی حقیقت و ماہیت اور مختلف معاشروں میں اس کے رسم و رواج کا ایک جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

یہ حقیقت خواچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ لفظ جہیز کا جو معنی و مفہوم اور جو تصور ہندوستانی معاشرے میں چل پڑا ہے اس کا نہ کوئی شرعی ثبوت ہے اور نہ عربی زبان و ادب اور نہ عربی معاشرے میں یہ لفظ اس طرح مروج ہے بلکہ عربی میں اس معنی و مفہوم کے لئے ایک دوسرا لفظ "جہاز" مستعمل ہے، جو جیم کے زبر اور زیر دونوں کے ساتھ بولا جاتا ہے اور لفظ "جہیز" اگرچہ صورتاً عربی لفظ معلوم ہوتا ہے مگر وہ عربی زبان میں موجود مستعمل نہیں ہے۔ بہر حال عربی میں لفظ "جہاز" کے حسب ذیل معنی آتے ہیں جس سے اس کی اصل حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔

جہاز العروس: دلہن کی ضرورت کی چیزیں
جہاز المسافر: مسافر کی ضرورت کی چیزیں
جہاز الجیش: فوج کی ضرورت کی چیزیں
جہاز المیت: مُردے کی ضرورت کی چیزیں۔ (لسان العرب نیز المعجم الوسیط)

اس اعتبار سے کسی چیز کا "جہاز" وہ سامان ہے جو اس کے لئے ضروری ہو اور اسی معنی میں سورۂ یوسف میں آیا ہے۔ فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ: جب یوسف نے ان کا

سامان تیار کردیا (سورۂ یوسف 12، آیت 70)۔

اس بحث سے یہ واضح ہوگیا کہ ایک مسافر یا ایک مُردے کی جو مختصر ضروریات ہوسکتی ہیں، اسی طرح ایک دلہن کی آرائش کے سلسلے میں جو مختصر ضروریات ہوں گی وہ اس کا "جہاز" یا "جہیز" ہوں گی۔ لہٰذا جہیز کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس میں کھانے پکانے کے برتن بھی ہوں، میز کرسی بھی ہو، پلنگ اور گدے بھی ہوں اور ریشمی پردے بھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فریج، ٹی وی اور دنیا بھر کی خرافات بھی ہوں۔ یہ لفظ جہیز کو ایک زائد مفہوم پہناتا ہے۔

آج کل جہیز کا جو غلط مفہوم اور رواج چل پڑا ہے وہ سراسر ایک غیر اسلامی تصور ہے جو ہندوستان اور شاید پاکستان کے سوا دنیا کے کسی بھی ملک میں نہیں پایا جاتا بلکہ سعودی عرب میں ہندوستانی رواج کے برعکس سارا "جہیز" لڑکے یا دولہا کو فراہم کرنا پڑتا ہے اور جب تک وہ پرتکلف ضروریات سے آراستہ ایک فلیٹ کا انتظام نہیں کرلیتا اس وقت تک وہ اپنی شادی کا تصور بھی نہیں کرسکتا اور مصر میں یہ رواج ہے کہ منگنی کے موقع پر جو مہر طے ہوتا ہے وہ ضروری ہے کہ لڑکا شادی سے قبل اپنے ہونے والے سسر کے حوالے کردے۔ پھر وہ اس میں اپنی طرف سے کچھ مزید رقم ملا کر بیٹی کے لئے جہیز تیار کرتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی صحیح اسلامی طریقہ نہیں ہے، مگر یہ صورت ہندوستان اور سعودی عرب کے رواج کے بین بین ہے اور یہ موجودہ ہندوستانی ہولناکی سے تو ہزار درجہ بہتر ہے۔ سعودی عرب اور خلیجی ممالک کی عورت غالباً دنیا کی سب سے زیادہ "مہنگی" عورت ہے، جسے حاصل کرنے کے لئے مہر اور آراستہ فلیٹ کے علاوہ اپنے سسر کو منہ مانگا سونا بھی دینا پڑتا ہے اور پھر شادی کے بعد اس کے مزید ناز نخروں کو برداشت کرنے کی راہ میں شوہر کو بسا اوقات خود کو نیلام تک کرنے کے لئے تیار رہنا پڑتا ہے۔ ورنہ بصورت دیگر اسے اپنے سسر کی "خونخواریت" کا سامنا کرنا پڑے گا۔ نکاح ثانی کا تو وہ تصور بھی نہیں کرسکتا۔ لہٰذا اسے اپنی بیگم کو خوش رکھنے کے لئے سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔

اس رواج میں اگرچہ بعض غیر شرعی چیزیں بھی پائی جاتی ہیں، لیکن اگر یہ رواج ہندوستان میں رائج ہوجائے تو یہاں کے "بیکار" نوجوانوں کو دن میں تارے نظر آنے لگیں گے جو "مفت" میں نہ صرف شادی کرلیتے ہیں بلکہ بیکاری میں بھی گویا "جنت" کے مزے

لوٹتے رہتے ہیں۔ یعنی "مال مفت دل بے رحم" اور علامہ اقبال کی زبان میں۔

عجیب چیز ہے احساس زندگی کا
عقیدہ "عشرت امروز" ہے جوانی کا

ظاہر ہے کہ جب مفت خوری اور عیاشی کا سارا سامان خود بخود مہیا ہو رہا ہو تو اب محنت ومشقت کرنے یا ہاتھ پیر ہلانے کو کس کا جی چاہے گا؟ گویا کہ ایسے پھرے نوجوانوں کا اپنے سسرال والوں پر ایک احسان ہے کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ گلچھرے اڑانے کی مزدوری اپنے سسر صاحبان سے طلب کریں۔ ورنہ پھر طلاق حاضر ہے یا اگر کوئی ہندو ہے تو پھر مٹی کا تیل اور دیا سلائی۔ کیا انسان اپنی تن آسانیوں کے لئے واقعتاً اس قدر پست اور ذلیل بھی ہو سکتا ہے؟ یہ بات سمجھ سے باہر ہے حالانکہ وہ اشرف المخلوقات ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس ذلیل ترین حرکت کی بدولت انسان کا درجہ تمام جانداروں میں سب سے زیادہ پست نظر آتا ہے۔ آپ چرندوں اور پرندوں بلکہ درندوں تک کی زندگی کا جائزہ لیجئے۔ آپ کو اتنی خود غرضی اور درندگی کسی بھی مخلوق میں نظر نہیں آئے گی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس لئے نہیں پیدا کیا کہ وہ دوسروں کا محتاج بن کر یا کاسہ گدائی دراز کرتے ہوئے اپنی زندگی بسر کرے۔ وہ حیوانات و نباتات کی طرح کوئی خودرو پودا نہیں ہے کہ جو جی میں آئے کرے یا جس طرح چاہے زندگی بتائے بلکہ وہ ایک ذمہ دار اور جوابدہ ہستی ہے۔ لہٰذا اسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے صحیح اور معقول رویہ اپنانا چاہئے۔ پرائے مال پر نگاہ ڈالنا اگرچہ وہ اس کے سسر ہی کا کیوں نہ ہو شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔ علامہ اقبال نے خوب فرمایا۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اسی حقیقت کو انہوں نے ایک دوسرے انداز میں اس طرح بیان کیا ہے۔

خودی کے نگہباں کو ہے زہر ناب
وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب

جہیز ایک جاہلی رواج

شریعت میں اس کی کوئی اہمیت نہیں

جہیز کے سلسلے میں موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کے طرز عمل پر علامہ اقبال کا یہ شعر پوری طرح صادق نظر آتا ہے۔

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

واقعہ یہ ہے کہ اسلامی شریعت نے جہیز کو پوری طرح نظر انداز کر دیا ہے۔ لہٰذا شرعی حیثیت سے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن اور حدیث میں ایسی کوئی "نص" یعنی صراحت شدہ بیان یا حکم موجود نہیں ہے جس کی بنا پر اس کو ضروری قرار دیا جا سکتا ہو، بلکہ اس کے برعکس شریعت نے گھریلو ضروریات کی فراہمی مرد پر واجب قرار دی ہے، جب نفقات واجبہ کے ذیل میں آتی ہیں اور گھریلو ضروریات میں کھانے پکانے کے برتن اور بستر وغیرہ سب کچھ آ جاتے ہیں۔ عورت کا نفقہ ہر حال میں مرد پر فرض ہے خواہ عورت اپنے ماں باپ کے گھر ہی میں کیوں نہ رہے۔

اس لحاظ سے جہیز کا رواج ایجاد بندہ ہے جو تمام تر ایک غیر اسلامی رسم ہے۔ اگر شریعت کی نظر میں اس کی ذرا بھی اہمیت ہوتی تو وہ صاف وصریح الفاظ میں اسے ضروری قرار دیتی۔ مگر پورے قرآن اور حدیث میں اس کی طرف اشارہ تک نہیں ملتا۔ (اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کو جو چیزیں دی تھیں وہ بطور جہیز نہیں تھیں) بلکہ اس کے برعکس قرآن اور حدیث سے یہ بات نکلتی ہے کہ نکاح کے لئے مال خرچ کرنا، ولیمہ کرنا اور عورت کا نان نفقہ برداشت کرنا سب کچھ مرد کے ذمہ ہے لڑکی یا لڑکی کے باپ پر اس سلسلے میں کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ ایک داماد کو دراصل اپنے سسر کا ممنون ومشکور ہونا چاہئے کہ اس کی خدمت اور فائدے کے لئے اس نے اپنی لخت جگر کو دل پر صبر کی سل رکھ کر اس کے حوالے کر دیا ہے۔ وہ لخت جگر جس کو اس نے پال پوس کر بڑا کیا تھا اور اسے تعلیم و تربیت سے آراستہ کر کے اس پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا تھا تا کہ وہ کسی اور کی زینت نہ بن

سکے اور کسی کے گھر کو آباد کر سکے۔ اس لحاظ سے لڑکی کے باپ کا ایک داماد کے لئے اصل تحفہ تو خود دلہن ہے جو اگر نیک صالح ہے تو حدیث کی تصریح کے مطابق دنیا کا سب سے بڑا تحفہ ہے کیونکہ عورت صحیح معنی میں انسانی تمدن اور اس کے ارتقا کا بنیادی عنصر ہے اور چمن زار حیات کی ساری رونق اسی کے دم سے ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو بزم کائنات بالکل سونی سونی بلکہ خاموش ہو جائے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جہیز کا موجودہ نظریہ ایک غلط اور جاہلی رواج ہے کیونکہ اول تو وہ لڑکی کے باپ پر ایک غیر عقلی و غیر فطری بوجھ ہے اور دوسرے یہ کہ اس غلط رواج کی وجہ سے غریبوں کی زندگی دوبھر ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے شریعت میں اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے کیونکہ وہ نہ صرف خلاف عقل اور ظلم بے جا ہے بلکہ مفت خوری اور عیاشی کا بھی ایک ذریعہ ہے اور اس منحوس رسم و رواج ہی کی وجہ سے آج کل کے بہت سے نوجوان کاہل اور عیاش نظر آتے ہیں اور کار زار حیات میں محنت و مشقت کرنے سے جی چراتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب مفت میں نہ صرف لڑکی بلکہ لڑکی والوں کا بہت سا مال و متاع بھی مل رہا ہو تو وہ موج و مستی اور خود فریبی کا ایک سستا نسخہ بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلامی شریعت اس قسم کے غیر معقول اور جاہلی رسم و رواج کی کبھی حمایت نہیں کر سکتی جو درحقیقت لڑکی کے باپ کا خون چوسنے کی ایک مذموم حرکت ہے۔

ہندو قانون کی کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ: چونکہ اصل ہندو قانون کے مطابق وراثت میں ایک عورت کا کوئی حصہ نہیں ہوتا اس لئے اسے شادی کے وقت خوب اچھی طرح سجا سنوار کر اور بہت کچھ دے دلا کر رخصت کر دیا جاتا تھا اور رسم شروع شروع میں ہندو مذہب کے صرف اونچے طبقات ہی تک محدود تھی۔ مگر آج اس کی جڑیں نہ صرف پورے ہندو معاشرے میں پیوست ہو چکی ہیں بلکہ اس منحوس رسم نے مسلم معاشرے کو بھی اپنے گھیرے میں لے لیا ہے اور اس کی وجہ سے پورا ہندوستانی سماج بلبلا رہا ہے اور ہر طبقے میں ہاہا کار مچی ہوئی ہے۔ لڑکیوں کو ناحق ستایا اور تنگ کیا جا رہا ہے۔ نئی نویلی دلہنوں کو جلا کر انہیں ناکردہ گناہوں کی سزا دی جا رہی ہے اور قانون فطرت اور قانون الٰہی کے ساتھ کھلے عام مذاق کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں سارا قصور ہندو مذہب کا ہے۔ جس کی رو سے شوہر کی

زندگی میں تو عورت کی حیثیت ایک داسی یا لونڈی کی طرح رہتی ہے اور شوہر کی موت کے بعد یا تو اسے بھی زبردستی مرجانا پڑتا ہے یا کسی آشرم میں ذلت کی زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔

امت مسلمہ کو اللہ تعالیٰ نے اصلاح عالم کے لئے مبعوث کیا ہے۔ لہٰذا اس کا فرض ہے کہ وہ ان جاہلی رسوم و خرافات کو مٹانے کے لئے کمر بستہ ہو جائے اور اس ملک میں عورت کو اس کا صحیح مقام دلانے کے لئے آمادہ عمل ہو اور اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے خود ان خرافات کو ترک کر کے صحیح اسلامی رسوم اور اسلامی ضوابط پر عمل کرے تاکہ وہ دوسروں کے لئے ایک نمونہ بن سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ آج مسلمان خود اپنی بداعمالیوں کے باعث غیر اقوام اور صحیح اسلامی قوانین کے درمیان ایک حجاب بلکہ سب سے بڑی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ اگر وہ صحیح اسلامی قوانین پر عمل کرنا شروع کر دیں تو پھر یہ رکاوٹ دور ہو سکتی ہے اور غیر مسلم اسلام کا صحیح اور روشن چہرہ دیکھ سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ صحیح اسلامی قوانین تو کتابوں میں بند ہیں اور مسلمان ان کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بدعملی میں مبتلا ہیں۔ تو اس اعتبار سے تہہ بہ تہہ تاریکیوں کے باعث آج دنیا صحیح اسلامی قوانین دیکھنے سے معذور ہے اور اس اعتبار سے آج مسلمان دہرے مجرم ہیں جو ایک طرف تو صحیح اسلام کو بھی چھپائے ہوئے ہیں اور دوسری طرف ایک حجاب بنے ہوئے ہیں۔

لہٰذا ان جاہلی رسوم سے دنیائے انسانیت کو نجات دلانے کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ خود مسلمان سب سے پہلے ان خرافات سے دور ہو جائیں۔ اس سے نہ صرف معاشرے کی اصلاح میں مدد مل سکتی ہے بلکہ اس سے درحقیقت اسلامی شریعت کا بھی بول بالا ہو سکتا ہے۔ آج ہندوستان میں یکساں سول کوڈ کی تحریک چل رہی ہے بلکہ اسلامی قانون کو مٹانے کے لئے خفیہ طور پر سازش بھی ہو رہی ہے۔ جس کا اصل مقصد ہندوستان میں آہستہ آہستہ ہندو تہذیب کو مسلط کرنا ہے لیکن اس اصلاحی اقدام کے ذریعے نہ صرف یہ تحریک ناکام ہو سکتی ہے بلکہ اس سے دہرے اور دور رس نتائج بھی نکل سکتے ہیں۔ ورنہ تغافل اور لاپروائی کی صورت میں اسلام کے نام لیواؤں کا بیڑا غرق ہو سکتا ہے۔ آج مسلمانوں کے حال زار پر علامہ اقبال کے وہ اشعار پوری طرح صادق آتے دکھائی دے رہے ہیں جن کے مطابق انہوں نے اس صدی کے شروع ہی میں اندیشہ ظاہر کر دیا تھا۔

نشان برگ گل تک بھی نہ چھوڑا اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
وطن کی فکر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

واضح رہے کہ افراد ہی سے قومیں اور ملتیں بنتی ہیں۔ لہٰذا اگر افراد کا کردار صحیح نہ ہو تو پھر ملت کا مقدر بھی درست نہیں ہو سکتا جیسا کہ علامہ اقبال ہی کا ارشاد ہے۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

نفقہ، مہر اور جہیز کے بعض مسائل

پچھلے مباحث سے جہیز کی شرعی حیثیت پوری طرح روشنی میں آ گئی اور اس کی قباحت بھی اچھی طرح واضح ہو گئی۔ مگر اس سلسلے میں ایک مسئلہ خوب اچھی طرح واضح رہنا چاہئے کہ شرعی و اخلاقی اعتبار سے جو چیز قبیح اور قابل مذمت ہے وہ فرمائشی جہیز یا لڑکے والوں کے مطالبات ہیں۔ ورنہ اگر کوئی شخص اپنی خوشی سے اپنی لڑکی کو بطور تحفہ کوئی چیز دے دے تو وہ قابل مذمت نہیں ہو سکتا ہے۔ مگر ہاں پھر بھی مالداروں کو اس سلسلے میں نمائش اور ریاکاری سے بچنا ضروری ہے تاکہ اس کے اثرات دوسرے پر پڑنے نہ پائیں اور بہتر یہ ہے کہ کوئی شخص اگر اپنی لڑکی کو کچھ دینا چاہے تو وہ اس کی نمائش ہرگز نہ کرے بلکہ لوگوں کی نظروں سے چھپا کر دے تاکہ دوسروں کو لالچ نہ پیدا ہو۔ نمائشی جہیز ہی تمام فتنوں اور مفاسد کی جڑ ہے لہٰذا اس سے کلی اجتناب ضروری ہے۔ آج معاشرہ میں جو برائیاں اور جو فتنے پروان چڑھ رہے ہیں ان کی بیخ کنی کے لئے ضروری ہے کہ ان کی اصل بنیادوں کو تلاش کر کے ان

کا استیصال کیا جائے ورنہ یہ سماجی فتنہ ختم نہیں ہو سکتا۔

نیز اس سلسلے میں مہر اور جہیز کے تعلق سے بعض خرابیاں اور غلط فہمیاں بھی پائی جاتی ہیں جن کا دور ہونا بہت ضروری ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ بہت سے لوگ مہر کو غیر ضروری اور جہیز کو ضروری قرار دیتے ہوئے نکاح کے موقع پر لمبے چوڑے مہر باندھ تو لیتے ہیں مگر ان کی ادائیگی کی نوبت نہیں آتی بلکہ بعض لوگ تو دینے کی نیت ہی نہیں رکھتے۔ ایسا کرنا سخت گناہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں جگہ جگہ اس کی تاکید کرتا ہے۔ مثلاً

وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً: اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دے دو (سورۃ نساء 4، آیت 4)

فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً: پھر ان عورتوں میں سے جن سے تم لطف اندوز ہو چکے ہو ان کے مقررہ حق (مہر) انہیں دے دو: (سورۃ نساء 4، آیت 24)

بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ مہر کا تعلق جہیز سے ہے۔ چنانچہ وہ مہر کو جہیز سے جوڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر ہم جہیز نہ لیں تو مہر بھی نہیں دیں گے یا بالکل تھوڑا اور حقیر قسم کا دیں گے جب کہ مہر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ایک فرض اور عورت کا ایک شرعی حق ہے جب کہ جہیز کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے بلکہ یہ ایجاد بند اور غیر اسلامی دستور ہے، جو باہر سے آیا ہے، غرض مہر کا جہیز سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کوئی عورت چاہے جہیز لائے نہ لائے مگر اس کا شرعی حق (مہر) اسے ضرور ملنا چاہئے۔

پچھلے صفحات میں فقہ حنفی کی کتاب ہدایہ کے حوالے سے گزر چکا ہے کہ عورت جب اپنے آپ کو شوہر کے حوالے کر دیتی ہے تو شوہر پر بیوی کے لئے کھانے، کپڑے اور مکان کی فراہمی واجب ہو جاتی ہے۔ (فعلیہ نفقتها و كسوتها و سكناها) (ہدایہ اولین صفحہ 417)

چنانچہ مکان کی فراہمی کے ساتھ ہی دیگر تمام لوازم زندگی بھی شوہر ہی کے ذمہ واجب ہو جاتے ہیں۔ عورت یا اس کے رشتہ داروں سے ان چیزوں کی فراہمی کا مطالبہ نہیں کیا

جاسکتا خواہ عورت کا مہر کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ کیونکہ مہر عورت سے استمتاع کرنے (جسمانی اعتبار سے لطف اندوز ہونے) کی وجہ سے عائد ہوتا ہے جہیز کی تیاری کی غرض سے نہیں۔ لہٰذا اس اعتبار سے مہر عورت کا خاص حق ہے جو نہ تو عورت کا باپ لے سکتا ہے اور نہ اس کا شوہر یا کوئی اور۔ (فقہ السنہ جلد دوم صفحہ 177)

مسئلہ: اگر کوئی شخص ایک بھاری مہر (مثلاً ایک ہزار اشرفی) باندھے اور اس قسم کے رواج میں عادت یہ ہو کہ اس کے عوض میں ایک بھاری جہیز بھی متوقع ہوتا ہو، مگر لڑکی جہیز میں کچھ بھی نہ لائے تو شوہر کو جہیز کا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ (کتاب الفقہ جلد چہارم صفحہ 176)

مسئلہ: جس طرح مہر عورت کا مال خاص اور اس کی ملکیت ہے اسی طرح وہ اپنے ماں باپ کے گھر سے جو کچھ بھی تحفے تحائف (بطور جہیز جو والدین اپنی خوشی سے بغیر کسی جبر و مطالبے کے دے دیں) لاتی ہے وہ سب اسی کی اپنی ملکیت ہوتی ہے اور اس کی اجازت کے بغیر شوہر کے گھر والے اسے استعمال نہیں کر سکتے اور خدانخواستہ طلاق ہو جانے کی صورت میں وہی ان سب چیزوں کی مالک ہوگی۔ یہ چیزیں شوہر کو کسی بھی طرح نہیں پہنچ سکتیں۔

مسئلہ: جہیز تو جہیز نکاح کے موقع پر شوہر اپنی بیوی کو جو کچھ مال و زیور اور کپڑے وغیرہ دیتا ہے وہ سب کچھ بیوی کی ملکیت ہوتے ہیں، جن کو واپس لینا شرعی اعتبار سے کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہو سکتا، خواہ طلاق ہی کی نوبت کیوں نہ آ گئی ہو، چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں صاف صاف فرماتا ہے۔

وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّ اٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا (سورۃ نساء 4، آیت 20) اگر تم ایک عورت کی جگہ (کسی وجہ سے) دوسری عورت کو بدلنا چاہو اور ایک کو بہت سا مال دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔ کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح گناہ کا ارتکاب کر کے واپس لو گے؟

مسئلہ: عورت نفقہ کی مستحق کب ہوتی ہے؟ تو اس کی بعض شرطیں یہ ہیں: (1) شرعی

طور پر نکاح صحیح ہو۔ (2) عورت اپنے آپ کو شوہر کے حوالے کر چکی ہو۔ (3) شوہر کو استفادہ کے لئے خود کو پیش کر چکی ہو۔ (4) شوہر اسے جہاں لے جانا چاہے اس سے وہ انکار نہ کرتی ہو۔ ہاں البتہ سفر کے ذریعے نقصان ہونے یا کسی قسم کا ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ (فقہ السنہ جلد دوم صفحہ 170 سے 171)

مسئلہ: شوہر اگر مہر ادا کر دے تو وہ اپنی بیوی کو اپنے گھر لے جا سکتا ہے۔ اگر عورت اپنے پورے مہر کا مطالبہ کرتے ہوئے اپنے گھر میں رک جائے تب بھی وہ نفقہ کی مستحق ہوگی کیونکہ وہ اپنے حق کی وجہ سے رکی ہوئی ہے۔

مسئلہ: اگر شوہر مہر ادا کر دے لیکن پھر بھی عورت اس کے گھر جانے سے انکار کر دے تو اسے نفقہ نہیں ملے گا کیونکہ یہ بات بغیر حق کے ہے۔ (کتاب النفقات، خصاف صفحہ 23)

مسئلہ: اگر عورت اپنے آپ کو (مباشرت کے لئے) شوہر کے حوالے کرنے سے انکار کر دے جب تک کہ اسے اس کا مہر نہ مل جائے تو (اس صورت میں بھی) عورت نفقہ کی مستحق ہوگی۔ (ہدایہ صفحہ 417)

یہ چند احکام و مسائل ہیں جن سے اسلامی شریعت کی روح اور اس کی روح معلوم کی جا سکتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں ہی کی طرح عورتوں کے حقوق کا بھی پاس و لحاظ رکھا ہے۔ یہ نہیں کہ مردوں کو یکطرفہ طور پر کھلی ہوئی چھوٹ دے دی ہو کہ وہ جس طرح چاہیں اپنی عورتوں کے ساتھ پیش آئیں۔ نظام تمدن کی اصلاح اور درستگی کے لئے ضروری ہے کہ مردوں ہی کی طرح عورتوں کے حقوق کی بھی نگہداشت کی جائے۔ مرد اور عورت کی ایک گاڑی کے دو پہیوں کی طرح ہیں کہ ان میں سے کوئی ایک پہیہ بھی اگر خراب ہو جائے تو گاڑی آگے بڑھ نہیں سکے گی۔ اسلام نے مرد اور عورت دونوں کو ان کی فطرت کے مطابق الگ الگ احکام دیئے ہیں اور ان کا دائرہ کار متعین کر دیا ہے جس میں خلل ڈالنا نظام فطرت کو بدلنا اور انسانی فطرت کو مسخ کرنا ہے۔ چنانچہ اسلام نے مالیات کی فراہمی کی ذمہ داری مرد کے سپرد کی ہے اور گھر کی دیکھ بھال اور شوہر کے حقوق کی نگرانی کی ذمہ داری عورت کے حوالے کی ہے مگر عورت کو مالیہ کی فراہمی کی ذمہ داری سونپنا اس پر ایک زائد بوجھ ڈلنا اور قانون فطرت کی خلاف ورزی کرنا ہے۔ جن معاشروں میں یہ وبا پھیل رہی ہے وہ اس کے

سنگین نتائج سے دو چار ہیں۔ مغربی و مشرقی دونوں ممالک میں آج عورت اس سماجی ظلم و ستم کی چکی میں پس رہی ہے۔ مگر ان دونوں جگہوں پر اس کی نوعیت مختلف ہے۔ مشرقی ممالک (ہندوستان اور پاکستان) میں اس کا استحصال جہیز کے نام پر کیا جارہا ہے تو مغربی ممالک میں معاشیات کے بار بوجھ میں عورت کو بھی شریک کر کے اس صنف نازک کو مختلف قسم کے مصائب و آفات میں مبتلا کیا جارہا ہے۔ اس طرح آج عورت دنیا کی مظلوم ترین ہستی نظر آرہی ہے، اگر چہ یہ سب کچھ اس کی آزادی کے قصیدوں اور ترانوں کی آڑ میں کیا جارہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آج عورت جس قدر مظلوم اور ستم رسیدہ ہستی ہے اتنی سابقہ کسی بھی دور میں نہیں تھی۔ اس کی آزادی محض ایک دکھاوا اور فریب اور اس کے ''حقوق'' محض کاغذی ہیں، جن کا واقعات کی دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے۔ اسلام اگر چہ عورت کو مردوں کے برابر حقوق دیتا ہے۔ مگر آج خود مسلمان اسلامی شریعت سے ناواقفیت کی بنا پر مرد اور عورت کے صحیح حقوق و فرائض اور ان کے حدود و آداب سے نابلد ہیں اور وہ محض اپنی جہالت کی بنا پر بد عملی میں مبتلا ہو کر غیر اسلامی طور طریقے اختیار کئے ہوئے ہیں لہٰذا ضرورت ہے کہ مسلمان اپنی شریعت اور اپنے قانون کا مطالعہ کر کے صدق دل سے اس پر عمل کریں۔ ورنہ موجودہ سماجی برائیوں کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ آج مسلم معاشرہ میں جو بھی خرابیاں موجود ہیں وہ سب اسلامی قانون سے ناواقفیت اور غیر اسلامی طور طریقوں کو اپنانے کا نتیجہ ہیں۔ لہٰذا غیر اسلامی طریقوں سے مکمل اجتناب ضروری ہے۔ ورنہ ہم اللہ قدوس کی رحمتوں اور اس کی نوازشات کے مستحق نہیں بن سکتے اور نہ ہم کو اللہ سے اپنے موجودہ مصائب و آفات کے بارے میں شکوہ کرنے کا کوئی حق حاصل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ہم کو سچے دل سے توبہ و انابت کا راستہ اختیار کرتے ہوئے کسی کی حق تلفی نہ کرنے کا عہد کرنا چاہئے۔ اللہ کے نزدیک حقوق العباد کی بڑی اہمیت ہے۔ لہٰذا ہمیں حقوق العباد کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہئے۔

☆☆ختم شد☆☆